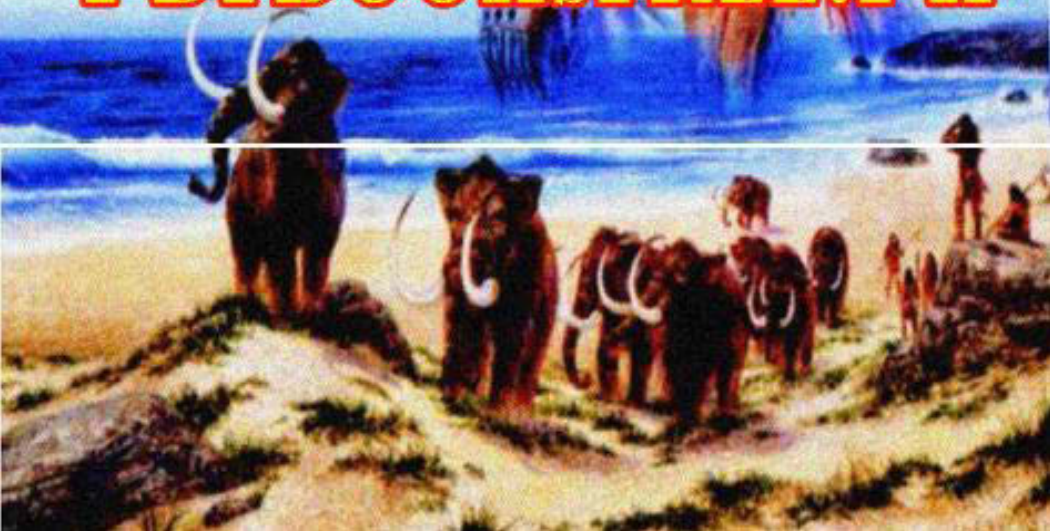


شکاریات کے موضوع پر دنیا بھر سے منتخب کہانیاں

آدم خور کا تعاقب

انتخاب:
طارق اسماعیل ساگر

PDFBOOKSFREE.PK



آدم خور کا تعاقب

(مہم جوئی، فرار اور انسانی عزم و ہمت کی لازوال داستانیں)

انتخاب

طارق اسماعیل ساگر

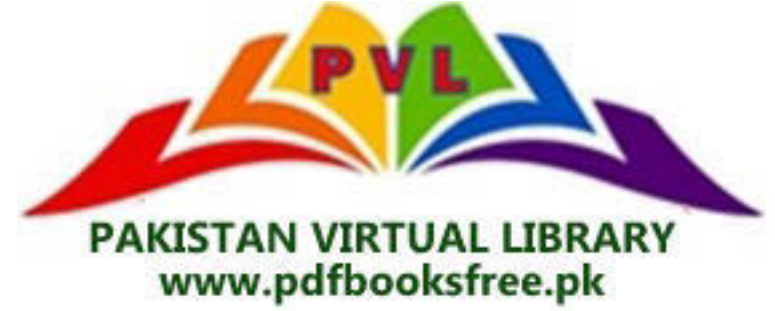


PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

سیونٹھ سرکاری پبلی کیشنز

الحمد مارکیٹ، 40۔ اردو بازار، لاہور

فون: 7223584-0300-4125230



ترتیب

۱. مامیر اور آدم خور مونیکا مارٹن
۲. جنگلی سور کا شکار سحر جان
۳. دیوبان کا آدم خور چیتا سلور ہیکل
۴. انگولا کا شیطان احمد الدین
۵. آدم خور کا تعاقب راؤر ستم علی خان
۶. شیر، رپچھ اور دریائی گھوڑا راجا سجاد خان
۷. ہار بھی جیت بھی ابو سہیل قریشی
۸. جنگل کا قانون سید رفیق حسین
۹. چنار گڑھ کا چیتا حاکم الدین
۱۰. شمیر گڑھ کا رپچھ حاکم الدین
۱۱. پاگل شیرنی راؤر ستم علی خان



جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

| | |
|------------|--------------------------------|
| نام کتاب | آدم خور کا تعاقب |
| انتخاب | طارق اسٹیل سائگر |
| ناشر | مسعود مفتی |
| مطبع | سیونٹھ سکائی پبلی کیشنز، لاہور |
| پروف ریڈنگ | زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور |
| سن اشاعت | اکتوبر 2008ء |
| قیمت | 200/- روپے |

..... ملنے کے پتے

سیونٹھ سکائی پبلی کیشنز

الحمد مارکیٹ، 40۔ اردو بازار، لاہور

فون 7223584-0300-4125230

مامیر اور آدم خور

رات خاصی جا چکی تھی..... باہر جنگل سائیں سائیں کر رہا تھا..... کبھی کبھار دور..... بہت دور سے کسی شیر کے دھاڑنے یا بندروں کے لگا تار چڑچڑانے کی مدہم آوازیں کان میں آتیں۔ اس روز خلاف معمول بھری طبیعت بڑی پریشان تھی..... بار بار اپنے شوہر کی طرف دھیان جاتا جو اچانک مجھے جنگل میں اکیلا چھوڑ کر نیروبی جا چکا تھا..... وہاں سے اس نے ابھی تک کوئی اطلاع نہ دی تھی..... انہی خیالوں میں گم تھی کہ دفعتاً مقامی عورتوں کے زور زور سے چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی دیں۔ ان کے بین کرنے سے معاً یہ شبہ ہوا جیسے جنگل میں چڑیلیں رورہی ہوں..... وہشت سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور بے اختیار میرا ہاتھ اس رائق کی طرف بڑھ گیا جو میں ہمیشہ بھر کر اپنے سر ہانے رکھ لیا کرتی تھی۔ اتنے میں اردلی اندر آیا۔ میں نے اس دوران میں تیل سے جلنے والے لپک کی بتی اونچی کر دی تھی۔ اردلی ہندوستان کا رہنے والا تھا اور ہم اسے کرمو کہتے تھے۔ میں نے دیکھا وہ تھر تھر کانپ رہا ہے اور اس کے منہ سے آواز نکل نہیں رہی تھی۔ بڑی مشکل سے وہ صرف اتنا کہہ سکا کہ تھوڑی دیر پہلے ایک بڑا درندہ گیم ڈیپارٹمنٹ کے انچارج شوکی ناگا کی نو جوان لڑکی اٹھا لے گیا ہے..... لڑکی نے درندے کے جڑے سے آزاد ہونے کے لئے بہت ہاتھ پاؤں مارے، لیکن کامیاب نہ ہوئی۔ اتفاق سے اس کے ہاتھ میں جھوپڑی کا اندرونی بانس آگیا جو چھت کو سہارا دینے کے لیے لگایا گیا تھا۔ لڑکی اس بانس سے ابھی اور درندہ گھبرا گیا۔ تاہم جاتے جاتے اس نے لڑکی کو ادھیڑ دیا اور اب اس کی خون میں نہائی ہوئی لاش ہستی کے کھلے میدان میں پڑی ہے۔ ایک لمحے کے لیے میرا ذہن سن ہو گیا..... میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس علاقے میں کوئی درندہ یوں انسانوں پر حملہ کر سکتا ہے..... گیم ڈیپارٹمنٹ کا انچارج شوکی ناگا، خود اچھا خاصا تجربہ کار شکاری تھا جس کی ساری زندگی انہی خطرناک جنگلوں میں گزر گئی تھی..... میں نے کرمو سے پوچھا شوکی ناگا کہاں ہے۔ اس نے بتایا وہ اپنے دفتر میں کچھ کام کر رہا تھا اور لڑکی اپنی جھوپڑی میں اکیلی تھی۔ درندے نے جھوپڑی کے گرد پہلے دو تین چکر لگائے اور ایک جگہ سے گھاس پھوس اکھاڑ کر اندر آنے کی کوشش کی۔ لڑکی بھی کوئی چھوٹا موٹا جنگلی جانور ہے، چنانچہ وہ ککڑی کا دروازہ کھول کر اسے دیکھنے باہر نکلی، بس اسی وقت درندے نے اسے دبوچ لیا۔

میں نے ٹھنڈی سانس بھری اور شوکی ناگا کی نو جوان لڑکی کا چہرہ آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا، مجھے یقین ہی نہیں آتا تھا کہ مامیر! اب اس دنیا میں نہیں..... اس کی عمر سترہ اٹھارہ برس کی تھی۔ بے حد تندرست اور خوش مزاج۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ انگریزی زبان فر فر بولتی تھی..... مقامی عورتوں کے برعکس اسے صاف ستھرا رہنے اور اچھے اچھے کپڑے پہننے کا شوق تھا..... ان دنوں مامیر کی شادی قبیلے ہی کے ایک ایسے نو جوان کے ساتھ طے پار ہی تھی جو گیم ڈیپارٹمنٹ کے سابق انچارج جانی بھارا کا اکلوتا بیٹا تھا اور نیروبی کے کسی کارخانے میں ملازمت کرتا تھا۔ میں نے رائق سنہالی اور ہستی کی جانب چلی..... جوں جوں آگے بڑھتی گئی۔ عورتوں کے چلا چلا کر بین کرنے کی آوازیں بلند ہوتی

گئیں..... شوکی ناگا کی جھوپڑی میں داخل ہوئی تو وہاں کئی مشعلیں دھڑا دھڑا رہی تھیں اور دروازے کے باہر مامیر کی خون میں لت پت لاش پڑی تھی۔ مامیر! کو اس عالم میں دیکھ کر میری آنکھیں بھی تر ہو گئیں۔ ایک جیتی جاگتی، ہستی کھیتی نو جوانی کا یہ انجام کس قدر بھیانک تھا! مامیر! کی بوزی ماں کی حالت تو دیکھی نہ جاتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اپنا ذہنی توازن کھو چکی ہو۔ مامیر! کا باپ شوکی ناگا اس قاتل کی تلاش میں جا چکا تھا۔ جس نے اس کے چھوٹے سے گھرانے کی خوشیاں چھین لی تھیں۔ وہ نہایت نڈر اور تجربہ کار شکاری تھا، اس لیے سب لوگ یقین سے کہہ سکتے تھے کہ درندہ اب اپنے انجام سے بچ نہ سکے گا۔

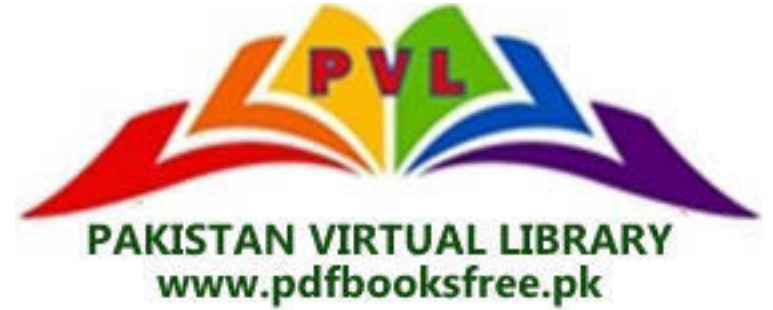
گھنے جنگل کے تقریباً وسط میں یہ ہستی دور جدید کی تمام آسائشوں اور سہولتوں سے قطعی محروم تھی۔ صرف خردی طرز کی چھوٹی چھوٹی جھوپڑیاں تھیں۔ کوئی بھی درندہ، چرند یا آدمی ان دیواروں کو چیر کر اندر آ سکتا تھا۔ دیواریں کیا تھیں، گھاس پھوس اور جھاڑ جھکاڑ کا مجموعہ تھیں۔ جنگل درندوں سے پناہ دیتا تھا۔ شیر، چیتے، جنگلی کتے اور بلیاں اس کثرت سے تھیں کہ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں انہیں کسی بھی وقت، کسی بھی لمحے ہستی کے ارد گرد گھومتے پھرتے دیکھا جاسکتا تھا۔ بعض اوقات یہ جانور کھانے کی چیزیں اٹھا کر لے جاتے۔ تاہم انہوں نے ابھی تک کسی انسان کو اپنا نوالہ نہیں بنایا تھا۔ اور یہ پہلا موقع تھا کہ کسی درندے نے معاہدے کی خلاف ورزی کی تھی جو اس ہستی کے باشندوں اور جنگل کے درندوں کے مابین عرصہ دراز سے امن کی علامت کے طور پر موجود تھا۔ جب میرے شوہر دلیم رابرٹ مارٹن نے کینیا کی سرزمین پر پہلی بار قدم رکھا، تبھی اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ مستقل طور پر یہیں ڈیرے ڈال دے گا۔ اس کا کہنا تھا اس قدر پرسکون، خوب صورت اور آرام دہ جگہ دنیا میں کم ہی ملے گی۔ پہلے تو میں اپنے شوہر کے اس ارادے سے خاصی پریشان ہوئی، لیکن بعد ازاں تجربے اور مشاہدے نے بتایا کہ وہ ٹھیک کہتا تھا۔ اس جنگلی ہستی میں کوئی چور تھا نہ ڈاکو۔ کسی کو کسی سے عداوت تھی نہ محاصرت۔ یہاں اخبارات کا وجود نہ تھا، جنہوں نے کرہ ارض کے کروڑوں افراد کی زندگیاں اجیرن بنا رکھی تھیں۔ یہاں وہ تمام نام نہاد آسائشیں نہ تھیں جن کے شہنچوں میں انسان نے خود کو بکڑ رکھا ہے۔ ہوائی جہاز تھے، نہ موٹر کاریں۔ گھنے جنگلوں کے اندر کوسوں میل پیدل ہی چلنا پڑتا تھا۔ دلیم اس موقع پر موجود ہوتا تو شوکی ناگا کا مامیر! کے قاتل کی تلاش میں ہاتھ بٹاتا اور دونوں مل کر اس کا خاتمہ کر دیتے، لیکن وہ نیروبی جا چکا تھا اور کچھ خبر نہ تھی، کب واپس آئے گا۔ شوکی ناگا کے لیے جوان بیٹی کی یوں ہلاکت بہت بڑا واقعہ تھی اور آدمی رات کو جنگل میں درندے کا تعاقب کرنا اسی کا حوصلہ تھا۔ وہ یہاں کے ایک ایک درخت، ایک ایک جھاڑی اور ایک ایک جانور سے خوب آگاہ تھا۔ اس کی گہری سیاد آنکھوں سے کوئی شے پوشیدہ نہ رہ سکتی تھی۔

مامیر! کی لاش میرے سامنے پڑی تھی۔ درندے نے اس کی گردن چبا ڈالی تھی۔ مامیر! کی سیاد لمبی گردن سے اس وقت بھی آہستہ آہستہ خون رس رہا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور ان میں ابھی تک وہی ہی چمک دمک تھی جیسی اس کی زندگی میں تھی۔ اس کا منہ کھلا تھا اور سفید سفید موتوں جیسے دانت شعلوں کی روشنی میں چکا چوند پیدا کر رہے تھے۔ کالے چہرے پر سفید دانت کچھ زیادہ ہی نمایاں ہوتے ہیں..... ایک بار تو مجھے بھی جھرجھری سی آگئی۔ میں نے رائق کی طرف دیکھی اور مامیر! کی لاش کے نزدیک بیٹھ گئی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ درندے کے جڑے سے آزاد ہونے کے لیے اس نے پوری قوت صرف کر دی تھی۔ اس کا ایک بازو جسم سے تقریباً الگ ہو چکا تھا۔ پیٹ اور سینے پر بھی گہرے گھاؤ آئے تھے۔ سب سے

بڑا نماں زخم گردن پر تھا۔ درندے کا پنجہ مایرا کی گردن پر پڑا تھا اور اس کی شرک کٹ گئی تھی۔

درندہ، مایرا کو اٹھا کر لے جانے میں ناکام رہا تھا، اس لیے یقینی بات تھی کہ وہ سخت جھلایا ہوا اور مشتعل ہوگا۔ ایسے عالم میں مردم خور درندوں کی فطرت یہ ہے کہ وہ شکار سے زیادہ دور نہیں جایا کرتے اور آس پاس ہی کہیں چھپ کر موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ شوکی ناگا، درندوں کی اس فطرت سے اچھی طرح آگاہ تھا اور اسی لیے وہ درندے کی کھوج میں نکل گیا۔ میں اس وقت کچھ نہ کر سکتی تھی۔ میں نے حفاظتی انتظامات کے سلسلے میں تمام آدمیوں کو ہدایت کی کہ وہ رات کا بقیہ حصہ جاگ کر گزاریں اور مشعلیں روشن رکھیں، مایرا کی جھوپڑی کے ارد گرد خاردار جھاڑیاں لاکر جمع کر دیں کہ وہ درندہ اگر آس پاس موجود ہو تو دوبارہ آسانی سے جھوپڑی کے اندر داخل نہ ہو سکے، مایرا کی لاش یہاں سے اٹھا کر کسی دوسری جگہ لے جائیں۔ اس کے بعد میں اپنے گھر واپس آ گئی۔ یہ گھر میرے شوہر نے مقامی باشندوں کی مدد سے بنوایا تھا اور اس کی دیواریں، کھڑکیاں، دروازے سب لکڑی کے تھے۔ چھت البتہ گھاس پھوس ہی کی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ دو چھوٹے چھوٹے گھر لکڑی کے چھ چھٹ اوپے ستونوں کے سہارے کھڑا کیا گیا تھا اور اس تدبیر کے کئی فائدے تھے۔ پہلا یہ کہ حشرات الارض گھر میں داخل نہیں ہو سکتے تھے اور دوسرا یہ کہ درندوں سے بھی محفوظ تھا۔

☆☆☆



گھر واپس آ کر میں بستر پر لیٹ گئی اور اردلی سے کہہ دیا کہ وہ باہر اس چوڑے پر سو جائے جو پچھلے کمرے کے ساتھ زمین سے کوئی دس بارہ فٹ کی اونچائی پر بنایا گیا تھا اور جہاں ہم صبح یا شام کے وقت بیٹھ کر ناشتہ کیا کرتے تھے۔ بستی والوں کو میں نے سمجھا دیا تھا کہ جو نبی شوکی ناگا واپس آئے، مجھے اطلاع کر دیں۔ میرا اندازہ یہ تھا کہ وہ صبح تک واپس آ جائے گا اور درندے کو ہلاک کرنے میں کامیاب ہو چکا ہوگا۔

بستر پر لیٹے لیٹے مجھے یاد آیا کہ دو ماہ قبل بھی ایسی ہی واردات اس بستی سے جنوب کی جانب سات آٹھ میل دور ہوئی تھی اور جنگل سے گزرتے ہوئے چند آدمیوں پر ایک قوی ہیکل شیر نے حملہ کر دیا تھا۔ دو آدمی تو درخت پر چڑھ گئے، جبکہ تیسرا باندھنیا شیر کے ہتھے چڑھ گیا۔ اس واردات سے خاصی سنسنی پھیلی، پھر معلوم ہوا کہ اس درندے کو مزید وارداتیں کرنے سے پہلے ہی ہلاک کر دیا گیا ہے۔ اس اطلاع سے لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا، مگر تازہ واردات سے یہی اندازہ ہوتا تھا، کہ وہ شیر ہلاک نہیں ہوا اور اب اپنی جگہ بدل کر وہ ادھر آچکا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی اور درندہ اس حرکت کا مرتکب ہوا ہو۔ ایسے حالات میں مجھے ولیم کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ صبح ہوتے ہی ولیم کو نیردبی اطلاع بھجواؤں گی۔ ولیم نے نیردبی روانہ ہوتے ہوئے مجھے ہدایت کی تھی کہ جنگل کے اندر اکیلے نہ جاؤں اور شوکی ناگا کے مشورے برابر سامنے رکھوں۔ مجھے دراصل چھوٹے موٹے پرندے شکار کرنے کا بڑا شوق تھا اور اس ضمن میں کئی مرتبہ میں اکیلے بھی جنگل کے اندر تک نکل جاتی تھی۔ دو تین مواقع ایسے آئے کہ درندوں سے ٹکرائی ہوئی، لیکن اس سے پہلے کہ میں گولی چلاؤں، درندے خود ہی راستہ چھوڑ کر دوسری جانب چلے جاتے۔ صبح سورج نکلنے ہی کر موکو چند آدمیوں کے ساتھ قریب کی دوسری بستی میں ہاتھی لانے کے لیے بھیجا۔ میں نے سوچا تھا ہاتھی پر سوار ہو کر جنگل میں جاؤں گی۔ قریبی بستی بھی وہاں سے آٹھ نو میل دور تھی اور کر موکو وہاں تک پہنچنے اور واپس آنے میں دو گھنٹے لگتے۔ تعجب اس پر تھا کہ شوکی ناگا واپس نہیں آیا تھا اور جوں جوں وقت گزر رہا تھا، تشویش اور خوف کی لہر برابر پھیلتی جا رہی تھی۔ مایرا کی لاش زمین میں گڑھا کھود کر دبا دی گئی۔

دوپہر تک کر مو واپس آیا اور اپنے ساتھ ایک قوی ایبھہ اور سدھایا ہوا ہاتھی بھی لایا، جو پانچ سال پہلے گیم ڈی پارکسٹ نے ایک مقامی شکاری سے خریدا تھا اور شکاری نے اسے جنگل سے اس وقت پکڑا جب وہ بہت چھوٹا تھا۔

شوکی ناگا کے واپس نہ آنے سے تشویش میں خاصا اضافہ ہو چکا تھا۔ میں نے کر مو کو اپنے ساتھ لیا، دونوں شکاری کتے اس کی تحویل میں دیے اور ہاتھی پر سوار ہو کر جنگل کے اندر ونی حصے کی طرف روانہ ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ جنگل میں تنہا نکلنے کا یہ پہلا موقع تھا، ورنہ اس سے پہلے ہمیشہ میرے ساتھ ولیم یا کوئی اور محافظ ضرور ہوتا تھا۔ جوں جوں میں آگے بڑھتی گئی، دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہوتا رہا۔ مہجان درختوں کی شاخوں اور پتوں میں چھپے ہوئے ہزاروں پرندے اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے۔ جنگل کی زندگی پوری طرح بیدار تھی۔

دفعہ ہاتھی چلتے چلتے رک گیا اور سوئڈا اٹھا کر بے تحاشا چنگھاڑنے لگا۔ مہادت نے اسے آگے بڑھانے کی کوشش کی، لیکن ہاتھی پیچھے ہٹنے لگا۔ میں نے چیخ کر کر مو کو فوراً کتے چھوڑ دینے کو کہا۔ دونوں کتے بجلی کی طرح دوڑے اور جنگل میں غائب ہو گئے۔ ہاتھی بدستور چنگھاڑ رہا تھا اور اس کی خوفناک آواز سے جنگل کی زمین تھرا رہی تھی۔ میں نے رائفل سیدھی کی۔ ہاتھی کا یوں بدحواس ہونا معمولی بات نہ تھی۔ یقیناً کوئی درندہ آس پاس ہی چھپا ہوا تھا۔ میں نے دھڑکتے دل سے ارد گرد کی جھاڑیوں پر نگاہ دوڑائی اور پھر اسے دیکھ لیا۔ وہ ایک قد آور اور خوبصورت چیتا تھا جو مجھ سے

کوئی ساٹھ فٹ کے فاصلے پر تھا۔ اس کی کھال کا رنگ جھاڑیوں کے رنگ میں کچھ اس طرح شامل ہو گیا تھا کہ عام حالات میں اس کا نظر آنا محال تھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں..... وہ بے حس و حرکت جھاڑیوں میں یوں دبکا ہوا تھا جیسے اس میں جان ہی نہ ہو۔ میں نے رائفل سے اس کا نشانہ لیا اور فائر کرنے ہی والی تھی کہ وہ جھاڑیوں میں سے نکلا اور سیدھا ہاتھی کی طرف آیا۔ اسی لمحے میری رائفل نے شعلہ لگا۔ گولی چیتے لگتی، وہ فضا میں کئی فٹ اونچا اچھلا اور زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ میں نے دوسرا فائر کیا، اس مرتبہ نشانہ چوک گیا۔ چیتا چند سینکڑ زمین پر لوٹ پوٹ ہونے کے بعد اٹھا اور دھاڑتا ہوا جنگل میں گھس گیا۔ تھوڑی دیر بعد کتوں کے بھونکنے کی آواز آئی اور پھر یوں لگا جیسے ان میں اور چیتے میں لڑائی ہو رہی ہو۔ ان کی آوازوں میں زخمی چیتے کی آواز نمایاں تھی۔ میں نے مہات سے کہا، ہاتھی کو آگے بڑھاؤ۔ اس نے ہاتھی کو آگے بڑھایا تو وہ چل پڑا۔ اس اثنا میں کرم ایک درخت پر پناہ لے چکا تھا۔ یکا یک میں نے اپنے عقب میں کچھ کھڑکی سی آواز سنی، مڑ کر دیکھا تو چار پانچ مقامی باشندے ہاتھوں میں لمبے لمبے نیزے تھامے اور کمر کے ساتھ بڑے بڑے کھلاڑے باندھے دوڑے آ رہے تھے۔ میں نے پہچان لیا۔ وہ سب کے سب ڈیم پائرمنٹ کے ملازم تھے اور شوکی ناگا کے ماتحت کام کرتے تھے، جس وقت مامیر اکو درندے نے جیر پھاڑ دیا تھا یہ لوگ ہستی میں نہ تھے اور اب غالباً واپس آئے تو انہیں اس حادثے کی خبر ہوئی۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ ایک چیتا شدید زخمی ہو کر بھاگا ہے اور ممکن ہے اس نے مامیر اکو ہلاک کیا ہو۔ اس کے علاوہ شوکی ناگا کا بھی کچھ پتہ نہیں۔ وہ کہنے لگے، اسی کی تلاش میں وہ آئے ہیں۔

ان مقامی شکاریوں کے آنے سے میرا حوصلہ بلند ہو گیا، لیکن اب مجھے اپنے کتوں کی بھی فکر تھی۔ انہوں نے یقیناً چیتے کو گھیر لیا تھا۔ ابتداء میں تو چیتے اور کتوں کی ملی جلی آوازیں آتی رہیں، پھر بند ہو گئیں۔ اس سے یہ اندازہ کرنے میں دقت نہ ہوئی کہ چیتے نے دونوں کتوں کو مار ڈالا ہے۔ میں نے کرم کو ہستی میں واپس جانے کا اشارہ کیا اور اسی طرف ہاتھی کو بڑھایا جدھر چیتا زخمی ہو کر بھاگا تھا۔ مقامی شکاری ہر طرح مستعد اور چاق و چوبند تھے اور مجھے پوری امید تھی کہ وہ ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر تیار ہیں۔

کوئی تین فلائنگ دور ایک چھوٹے سے پہاڑی ٹیلے کے قریب مجھے دونوں کتوں کی ادھڑی اور نچی ہوئی لاشیں مل گئیں۔ آس پاس خون بڑی مقدار میں بکھرا ہوا تھا۔ اس سے ظاہر تھا کہ کتوں اور چیتے کے مابین خاصی زبردست جنگ برپا ہوئی ہے اور چیتا چونکہ پہلے ہی زخمی تھا، اس لیے کتوں نے اسے مزید زخم پہنچائے ہوں گے۔ میں نے ہاتھی سے اتر کر اس مقام کا کچھ اچھی طرح معائنہ کیا۔ مقامی شکاریوں نے بتایا کہ اس خون کے ساتھ ساتھ چیتے کے بدن سے بہنے والا خون بھی شامل ہے۔ کتوں کا خون سیاہی مائل سرخ تھا اور زمین پر جہاں جہاں گرا، وہیں جم گیا تھا..... جبکہ چیتے کا خون خالص، گہرا سرخ اور کسی قدر پتلا تھا اور ابھی تک جمانا تھا۔ یہ خون بہت زیادہ تھا اور مشرقی جانب ٹیلے کے گرد گھوم کر جنگل کے اس حصے تک چلا گیا تھا جہاں دن کے وقت بھی گہری تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے شکاریوں سے پوچھا ان حالات میں کیا کرنا چاہیے۔ ان سب کا ایک ہی جواب تھا کہ چیتے کو ڈھونڈنا ضروری ہے، ورنہ زخمی ہونے کے بعد اس درندے کا مستقل طور پر آدم خور بن جانا لازمی ہوگا۔

اب میرے سامنے بیک وقت تین دشوار ترین مراحل تھے۔ اول اس درندے کو ڈھونڈنا، جس نے مامیر اکو ختم کیا تھا۔ دوم اس چیتے کو مارنا جو زخمی ہو کر بھاگا تھا اور جنگل میں کہیں چھپ گیا تھا۔ تیسرا کام شوکی ناگا کا کھوج لگانا تھا اور یہ پہلے دونوں کاموں سے کہیں زیادہ اہم تھا۔

شوکی ناگا کے ایک تابع نے مجھے بتایا کہ جنگل میں مشرقی سرحد کے ساتھ ساتھ ایک چھوٹی سی ہستی ملاو نام کی آباد ہے۔ شوکی ناگا کے اکثر رشتے دار وہاں رہتے ہیں، ہو سکتا ہے وہ وہاں چلا گیا ہو۔ اس کی یہ بات سن کر مجھے کسی قدر اطمینان ہوا اور نامعلوم درندے اور زخمی چیتے کا خیال چھوڑ کر شوکی ناگا کو تلاش کرنے کا فیصلہ کیا وہ ل گیا تو درندے سے ٹھنڈا آسان ہو جائے گا۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ مقامی شکاری پیدل تھے اور میں ہاتھی پر سوار۔ مجھے کچھ اچھاندہ لگا کہ وہ اتنی دور پیدل چلیں، چنانچہ میں نے ہاتھی کو واپس ہستی جینے کا ارادہ ظاہر کیا۔ رائفل کے علاوہ میرے پاس بھرا ہوا ایک ریوا لور اور زائد کارتوس بھی تھے۔

جنگل کے اندر پیدل چلنے کا یہ پہلا اتفاق تھا اور تھوڑی دیر بعد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ ہاتھی کو واپس بھیج کر میں نے غلطی نہیں، سخت حفاظت کی ہے۔ ہر قدم پر خاردار جھاڑیاں راستہ روکتی تھیں اور کہیں کہیں درخت اتنے گھجائے تھے کہ آگے جانے کے لیے لمبی گھاس میں سے گزرتا پڑتا تھا۔ ہر لمحے خطرہ تھا۔ کوئی چھپا ہوا درندہ یا سانپ نکل نہ آئے۔ مقامی باشندے پوری طرح چوکے ہو کر آگے آگے جا رہے تھے اور راستہ صاف کرتے جاتے تھے۔ کچھ دور تک تو زخمی چیتے کے خون کے نشانات نظر آتے رہے، پھر وہ شمال کی طرف مڑ کر جھاڑیوں میں اس سلسلے میں داخل ہوئے جن کے اندر گھسنا محال تھا۔ تھوڑی دیر سستانے کے بعد ہم نے مشرق کی جانب اپنا سفر دوبارہ شروع کیا۔ ملاو ہستی کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ وہ زیادہ دور نہیں، لیکن چلتے چلتے ناکس شل ہو چکی تھیں اور تھکن کے مارے برا حال تھا اور ہستی کے دور دور آثار نہ تھے۔ مجھے وہم ہوا کہ شاید ہم راستہ بھول کر کسی اور طرف جا نکلے ہیں، مگر شکاریوں نے یقین سے کہا کہ ہم راستہ نہیں بھولے اور صحیح سمت میں جا رہے ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق ہم نے دس میل کا فاصلہ اور طے کر لیا تھا۔ جنگل کے اندر خاصی خشکی اور تاریکی تھی اور ایک ایسا بولناک سناٹا کہ خواہ خواہ روح کا پتہ ہی نہ ملے۔ راستے میں دو مقامات ایسے آئے جہاں سے گزرتے ہوئے ہم نے شیر کے غرانے کی آواز سنی۔ معلوم ہوا کہ قریب ہی ایک ندی بہتی ہے اور وہاں جنگل کے درندے، چرندے اور پرندے سب اپنی اپنی پیاس بجھانے آتے ہیں۔

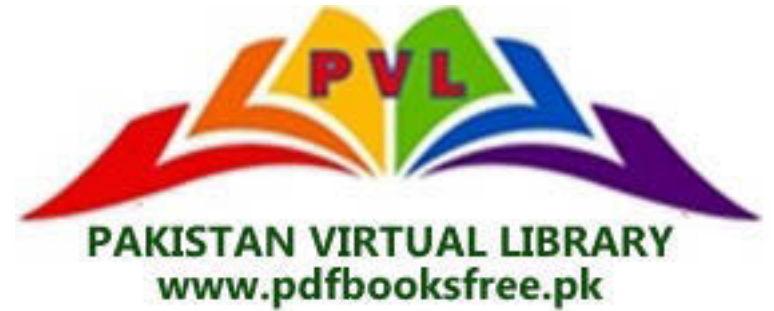
ساتھیوں نے مشورہ دیا کہ فی الوقت شیر سے ڈھکیڑا اچھی نہ ہوگی۔ لہذا راستہ بدلنا ضروری ہے۔ یوں بھی ہم سب اتنے خستہ اور تھکے ماندے تھے کہ شیر تو بڑی بات ہے، اس وقت معمولی سے لکڑی کے مقابلہ بھی نہ کر سکتے تھے، اس لیے ایک لمبا پکڑ کاٹ کر مشرق کا رخ کرنا پڑا۔ جوں جوں آگے بڑھ رہے تھے، جنگل صاف اور کھلا ہوتا جا رہا تھا۔ یہاں جھاڑیاں اور لمبی گھاس کثرت سے نہ تھی اور آسمان پر چمکتے ہوئے سورج کی شعاعیں آسانی سے جنگل کے اندر دورنی حصے تک پہنچ رہی تھیں۔

دفعتاً میرے ساتھی اپنی اپنی جگہ رک گئے اور جانوروں کی طرح منہ فضا میں اٹھا اٹھا کر کچھ سونگھنے لگے۔ ان کی یہ حرکتیں میرے لیے حد درجہ دلچسپ اور حیرت خیز تھیں۔ یقیناً وہ کسی جانور یا آدمی کی بو پارہے تھے۔ چند لمحے وہ شکاری کتوں کے مانند ادھر ادھر گردیں اٹھائے تیزی سے گھومتے رہے۔ کبھی آگے بڑھتے کبھی پیچھے آ جاتے۔ انہوں نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ بھی کیا بلکہ ایک درخت کے تنے کے عقب میں چھپ جانے کی ہدایت کی۔ میں اس وقت ان لوگوں کی پراسرار حرکتوں سے اس قدر مرعوب ہو چکی تھی کہ بغیر سوچے سمجھے ان کے احکام کی قیمل کر رہی تھی۔ یکا یک ایک شکاری کے حلق سے گھٹی گھٹی سی چیخیں نکلیں۔ پھر اس کا طاقتور بازو جنبش میں آیا۔ لمبا مضبوط نیزہ اس کے ہاتھوں سے نکلا اور سنسناتا ہوا

ایک جھاڑی کی طرف گیا۔ عین اسی لمحے شیر کی گردن سے جنگل کا نپ اٹھا۔ وہ خوب صورت اور جوان شیر تھا اور نہ جانے کب سے جھاڑیوں میں چھپا بیٹھا تھا۔ اس نے پلک جھپکتے میں اس شکاری پر حملہ کیا جس نے اس کی طرف نیزہ پھینکنے کی جرأت کی تھی۔ شکاری اس وقت بالکل تباہ تھا اور شیر کے اچانک حملے سے اس قدر سراپا ہوا کہ بے چارہ ذرا بھی حرکت نہ کر پایا۔ میں نے دیکھا شیر نے دائیں پنجے سے اسے نیچے مگرادیا اور اس کی گردن اپنے جڑے میں دبا کر دو تین بار اسے زور سے جھٹکے دیئے کہ اس کے منہ سے آواز ہی نہ نکل سکی اور وہ وہیں مر گیا۔ اس دوران میں بقیہ شکاری انتہائی دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے شیر کو چاروں طرف سے گھیر چکے تھے۔ ان کے نیزے اٹھے ہوئے تھے جن کی انہوں کا رخ شیر کی جانب تھا۔ شکاریوں کی آنکھیں لال لال تھیں، اور میں نے دیکھا کہ ان میں اور ایک وحشی جنگلی درندے میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔

شیر سخت غیظ و غضب میں پھرا ہوا تھا اور چند سیکنڈ تک وہ ایک ہی دائرے میں گھومتا اور گرجتا رہا۔ شکاری بے خوفی سے اس کے گرد گھیرا تنگ کرتے جا رہے تھے۔ پھر ان سب کے بازو بیک وقت فضا میں بلند ہوئے اور چار نیزے ایک ہی لمحے میں شیر کا بدن چھیدنے کے لیے سنسناتے ہوئے گئے۔ ایک نیزہ شیر کی گردن میں پیوست ہو گیا اور دوسرا اس کی پسلیوں میں لگا، بقیہ دو نیزے سامنے درخت کے تنے میں جا لگے۔ شیر نے شکاریوں کی طرف جست لگائی، لیکن ان کی پھرتی اس بلا کی تھی کہ وہ اب چمکدار پھلوں والے کلباڑے سنبھالے ہوئے درندے کا استقبال کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ میں اپنی جگہ وحشت زدہ یہ منظر دیکھ رہی تھی اور اگرچہ میرے ہاتھ میں بھی رائفل تھی۔ تاہم مجھ میں اتنا حوصلہ ہی نہ تھا کہ شیر پر فائر کر سکتی۔ شیر نے اچھل کر ایک اور شکاری کو دبوچ لیا۔ درندے کے جسم میں دو نیزے پیوست تھے۔ اس کی گردن اور پسلیوں سے خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے، لیکن اس نے کوئی کمزوری نہ دکھائی اور دوسرے شکاری کو آٹا فانا ڈھیز کر رکھ دیا۔ وہ بد نصیب کلباڑے سے ایک وار بھی نہ کر سکا، جبکہ تینوں شکاری شیر پر ٹوٹ پڑے اور پھر آدمیوں اور درندے میں ایسی خوفناک خون ریز جنگ کا آغاز ہوا جسے میں مرتے دم تک فراموش نہ کر سکوں گی۔

☆☆☆



شیر پر کلباڑوں کے پے در پے وار پڑنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ ایک شکاری نے پوری قوت سے کلباڑا شیر کی کھوپڑی پر مارا۔ شیر نے اسی وقت جست لگائی اور کلباڑے کا وار اس کی کھوپڑی پر پڑنے کے بجائے شانے پر پڑا۔ خون کا تیز تیز فوارہ شیر کے شانے سے اچھلا اور یہ اتنا تیز تھا کہ وار کرنے والا سیاہ فام شکاری، درندے کے خون میں نہا گیا۔ وزنی کلباڑے کا تیز دھار پھل شیر کے دائیں شانے میں گہرائی تک اتر چکا تھا، مگر درندہ بھی موسم کا ہوتا تھا۔ اس کے تیروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اتنے مہلک اور گہرے زخم کھانے کے باوجود اس کا دم خم ابھی تازہ ہے۔ اس نے اچھل کر حملہ آور کو منہ میں دبا لیا اور تین چار جھٹکے دیئے جس سے شکاری کی گردن دھڑے تقریباً الگ ہی ہو گئی۔ اپنے تیسرے ساتھی کا بھی ایک انجام دیکھ کر بقیہ دو شکاریوں پر بہت طاری ہو گئی اور وہ بھاگ کر جھاڑیوں میں جا چھے۔ میں سمجھ چکی تھی کہ وہ اپنی قدیم روایات کے مطابق شیر کو کوئی ایسی بدروح سمجھ رہے ہوں گے جو کسی حالت میں بھی مر نہیں سکتی۔

ان دونوں کو راہ فرار اختیار کرتے دیکھ کر میرے رہے سہے افسانہ بھی خطا ہو گئے۔ میں نے کئی بار رائفل سیدھی کر کے شیر کی کھوپڑی کا نشانہ لینے کی کوشش کی، مگر میرے ہاتھ بری طرح لرز رہے تھے اور میں ایک بھی فائر نہ کر پائی۔ شیر اس وقت تک شکاری کی لاش کو دبوچے خونی کھیل کھیلنے میں مصروف تھا، حالانکہ دو نیزے ابھی تک اس کی گردن اور پسلیوں میں پیوست تھے۔ میرے اندازے کے مطابق شیر کا خاصا خون بہہ چکا تھا۔ تاہم حیرت یہ تھی کہ اس کے اندر جھکن یا خشکی کے کوئی آثار نہ تھے۔ میرا اور شیر کا درمیانی فاصلہ مشکل سے تیس چالیس فٹ کا ہو گا اور چونکہ میں ایک بڑے درخت کے وسیع تنے کی آڑ میں دیکھی کھڑی تھی، اس لیے اس کی نگاہ ابھی تک مجھ پر نہ پڑی تھی۔ ادھر میرا یہ عالم کہ وہ شست سے لرزاں وترساں اور ایک بھی فائر نہ کرنے کے قابل مجھے کچھ پوچھو نہیں ہوتا تھا کہ میرا وقت پورا ہو چکا ہے۔ شیر نے جوئی مجھ کو دیکھا آٹا فانا میری طرف لپکے گا اور..... اس سے آگے کچھ سوچنا میرے لیے محال تھا۔ ذہن اور جسم کی تمام قوت مفلوج ہوتی جا رہی تھی۔ میری جگہ کوئی عورت تو درکنار، بڈر سے نڈر اور تجربے کا رے تجربے کا مرد شکاری بھی ہوتا تو اس کی کیفیت مجھ سے کچھ مختلف نہ ہوتی۔ میری نظروں کے عین سامنے تین آدمیوں کی لاشیں پڑی تھیں اور انہیں شیر نے ہلاک کیا تھا اور اب میری باری تھی۔ میں نے درخت کی بلندی پر نگاہ دوڑائی۔ اس کا تنا خاصا بڑا تھا اور پہلی شاخ جس پر میں اگر چڑھنے کی لائق ہوتی، زمین کی سطح سے کم از کم دس بارہ فٹ اونچی تھی۔ اس کے علاوہ درخت پر چڑھنے کے لیے جس پھرتی، چستی اور مہارت کی ضرورت ہوتی ہے، وہ مجھ میں سرے سے موجود نہ تھی۔ ایک ایک ثانیه موت اور زندگی میں فاصلہ کم کر رہا تھا اور مجھے جلد فیصلہ کرنا تھا کہ شیر کا تر نوالہ بن جانا ہے یا جان بچا کر واپس ہستی تک پہنچنا ہے۔

شیر غراغرا کر انسانی لاشوں کو نوچتا اور بھجھوڑتا رہا۔ اس کے طیش کی کوئی انتہا نہ تھی۔ رفتہ رفتہ میں نے محسوس کیا کہ اس پر نقاہت طاری ہو رہی ہے۔ اس کے جسم کے تین مختلف حصوں سے خون کی نالیاں ہی بندھی ہوئی تھیں اور میں پچیس فٹ کے دائرے میں کوئی جگہ ایسی نہ تھی جو انسانوں اور درندے کے ملے جلے خون سے تر نہ ہو چکی ہو۔ اتنے میں میرے بائیں ہاتھ پھیلی ہوئی لمبی لمبی گھاس میں سے کئی گیڈر ہو ہو کر تھکے اور تیزی سے دوڑتے ہوئے دوسری جانب کی جھاڑیوں میں گم ہو گئے۔ صاف ظاہر تھا کہ کوئی اور بڑا جانور ان گیڈروں کے تعاقب میں ہے۔ اس مشاہدے نے میرا خون ہی خشک کر کے رکھ دیا۔ عین اس لمحے میرے ہاتھ سے رائفل چھوٹ کر گری اور شیر نے گھوم کر ادھر دیکھا، اس کی آنکھیں انگاروں کی

طرح دیکھ رہی تھیں۔ وہ آخری مرتبہ پوری قوت سے دھاڑ کر میری طرف بڑھا۔ اس وقت خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ مجھ میں کہاں سے حوصلہ اور ہمت پیدا ہوئی۔ میں نے فوراً جھک کر اپنی رائفل اٹھائی اور شیر کا نشانہ لے کر لمبی دبا دی۔ فائر کے دھماکے سے جنگل کی فضا ایک لمسے کے لیے کانپتی۔ دوڑتا ہوا شیر فضا میں کئی فٹ اونچا اچھل کر زمین پر اُلٹا گر اور ترپنے لگا۔ میں نے اس مرتبہ دوسرا نشانہ لیا اور اس کی کھوپڑی میں گولی اتار دی۔ میرا اور شیر کا اس وقت درمیانی فاصلہ بارہ چودہ فٹ سے زیادہ نہ تھا۔ یہ گولی کارگر ثابت ہوئی۔ شیر کا جسم کچھ دیر تھر تھارتا رہا، پھر بسے وحشت ہو گیا۔

درد سے کی گرج اور فائرؤں کے دھماکوں سے جنگل کی زندگی میں انقلاب آ گیا۔ ہزاروں پرندے چیختے چلاتے آسمان پر چکر کاٹنے لگے۔ میں نے خود کو پسینے میں شرابور پایا اور جب ہوش دھواں ذرا ٹھکانے لگے، تب اونچی آواز میں ان دو مقامی شکاریوں کو پکارنا شروع کیا جو درندے کے ہاتھوں جانیں بچا کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ مجھے یقین تھا، وہ زیادہ دور نہ گئے ہوں گے اور کسی درخت پر چڑھ کر شاخوں میں چھپنے کے بعد شیر کے مرنے کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ مجھے ان دونوں پر بڑا غصہ آ رہا تھا اور میں سوچ رہی تھی کہ جس طرح وہ مجھے شیر کے منہ میں دھکیل کر اور اپنی جانیں بچا کر بھاگے ہیں، وہ جرم بہر حال ناقابل معافی ہے۔ کوئی پندرہ منٹ بعد وہ دونوں بری طرح سبے اور گھبرائے ہوئے نمودار ہوئے۔

میں نے اس موقع پر انہیں ڈانٹنا ڈپٹنا مناسب خیال نہ کیا اور صرف اتنا کہا کہ انہیں کم از کم اپنے ساتھیوں کی لاشیں چھوڑ کر نہ جانا چاہیے تھا۔ انہوں نے مرے ہوئے شیر کے جسم سے دونوں نیزے نکالے اور اپنے تیسرے ساتھی کا نیزہ اور کلباڑا بھی سنبھال لیا۔ شیر کی لاش کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ وہ اسے ابھی یونہی پڑا رہنے دیں گے اور بعد میں موقع پا کر ہستی کی طرف اٹھالے جائیں گے۔ میں نے کہا جنگلی جانور شیر کی لاش تو جیس کھسٹیں گے اور یوں کھال خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔ بہتر ہے، اسے کسی نہ کسی طرح ابھی اٹھا کر لے چلو، مگر انہوں نے معذوری ظاہر کی اور مجھے اشارے سے سمجھایا کہ شیر کا وزن پانچ سو پونڈ سے کسی طرح کم نہ ہوگا۔ اتنے بھاری وزن کا اٹھانا دو آدمیوں اور ایک عورت کے لیے ناممکن ہے۔ بدبختوں نے مجھے بھی اپنے ساتھ شامل کر لیا تھا۔ اس پر مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ نیزہ اور کلباڑا ان قدیم افریقی وحشی قبائل کے دو کارآمد اور ضروری ہتھیار تصور ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کی مہارت اور مشق حیرت انگیز ہے۔ اگرچہ زمانے کے ساتھ ساتھ انہیں بندوق اور رائفل چلانے کا ڈھنگ بھی آ گیا ہے، لیکن بیشتر قبائل نیزے، کلباڑے اور چھری ہی پر زیادہ بھروسہ کرتے ہیں۔

میں نے اس قوی بیکل شیر کی لاش کا نزدیک جا کر اچھی طرح معائنہ کیا۔ اسے قریب سے دیکھ کر بھی بدن پر لرزہ طاری ہوتا تھا۔ ایسا بڑا اور مہیب شیر میں نے پورے افریقہ میں اپنے دس سالہ قیام کے دوران میں دوبارہ نہیں دیکھا۔ میرا گمان تھا کہ یہ وہی درندہ ہے جس نے پچھلی شب شوکی ناگا کی جوان بیٹی امیرا کو ہلاکت سے دوچار کیا اور کچھ عجب نہیں کہ اسی درندے نے جنگل میں بعد ازاں موقع پا کر شوکی ناگا کو بھی مار ڈالا ہو۔

اسی وہم کے زیر اثر میں نے ان دونوں شکاریوں کو ڈانٹ کر حکم دیا کہ وہ آس پاس کے علاقے میں اچھی طرح گھوم پھر دیکھیں، مجھے یقین ہے کہ شوکی ناگا کا پتہ نہ ملا تو میں ان دونوں کو فائر کر کے اسی طرح مار ڈالوں گی جس طرح شیر کو مارا ہے۔ یہ دھمکی خاصی کارگر ثابت ہوئی۔ خوف اور بدحواسی ان دونوں کے چہروں سے عیاں تھی۔ وہ فوراً میرے سامنے سجدے میں گر گئے اور گھاس میں اپنی ناکیں رگڑنے لگے۔

میں ایک محفوظ مقام پر جا بیٹھی اور دونوں شکاری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ میں نے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔ سورج ڈوبنے

میں ابھی پورے دو گھنٹے باقی تھے اور اس وقت میں ہستی واپس بھی پہنچنا تھا۔ مزید ایک گھنٹہ گزر گیا اور جنگل میں تاریکی تیزی سے قدم جمائے لگی۔ مجھے اپنی حماقت پر پھر غصہ آنے لگا۔ فرض کرو، وہ دونوں واپس نہ آئے تب میں کیا کروں گی؟ ہستی یہاں سے بہت دور نہیں تو قریب بھی نہیں۔ اور پھر اتنے بھیاں جنگل میں بڑھتی ہوئی تاریکی میں تنہا ایک عورت کا سفر..... راہ میں کوئی جان لیوا حادثہ پیش آ سکتا تھا۔ اس احساس ہی سے میرا ذہنی توازن درہم برہم ہونے لگا اور میں اسی وقت اپنی جگہ سے اٹھ کر چلنے کے لیے تیار ہو گئی۔ میرا خیال تھا کہ شکاری جب مجھے وہاں نہ پائیں گے تو ڈھونڈنے کے لیے وہی راستہ اختیار کریں گے جو ہستی کی طرف جاتا ہے۔

ابھی میں پچاس ساٹھ قدم ہی چلی تھی کہ عقب سے دونوں شکاری بھاگتے ہوئے آئے۔ وہ مسلسل چلا رہے تھے۔

”وہل گیا..... وہل گیا.....“

”وہ وہاں ہے جہاں بھوتوں کا ڈیرہ ہے..... وہ انہیں سکتا..... وہ مر چکا ہے.....“

میں پتھر ہو گئی۔ ”کیا تم لوگ شوکی ناگا کی بات کر رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

انہوں نے بیک وقت اثبات میں گردنیں ہلا دیں۔ ”ہاں..... شوکی ناگا..... بے چارہ..... مر گیا ہے.....“

اس مقام سے کوئی دو میل دور، شمال مشرقی حصے کی جانب جہاں چھوٹے بڑے پہاڑی ٹیلے کثرت سے تھے اور جن میں ہزاروں لاکھوں چمکاؤں صدیوں سے رہتی آئی تھیں۔ ایک ٹیلے کے پاس شوکی ناگا کی تنگ دھڑنگ لاش پڑی تھی۔ میں نے دیکھا، درندے نے اس کی گردن نوچ کر پرے پھینک دی تھی اور نچلا آدھا دھڑسارے کا سارا ہڈ پ کر لیا تھا۔ سرخ رنگ کی ایک جیکٹ وہیں ادھڑی اور پھٹی ہوئی ایک جھاڑی کے اوپر لٹک رہی تھی اور یہی جیکٹ دور سے دیکھ کر ان دونوں آدمیوں نے شوکی ناگا کا سراغ لگایا تھا۔ اس کی لاش نہایت خراب حال میں میری نگاہوں کے سامنے پڑی تھی اور مجھے یقین نہ آ رہا تھا کہ ایک ہی رات میں یہ کیا سے کیا ہوگا۔ اچھا خاصا ایک گھرانہ آجڑ کر رہ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ درندے نے عقب سے شوکی ناگا کو چاٹ کر آن دوچا، ورنہ وہ آسانی سے زیر ہونے والا شخص نہ تھا۔

شیر نے شوکی ناگا کی لاش کے چند اجزاء اسے اپنا پیٹ بھرنے کے بعد اسے وہیں چھوڑ دیا تھا اور پھر گینڈوں نے دعوت اُڑائی۔ لاش کے ان بچے کچھے حصوں پر بے شمار کھیاں، جھنکار ہی تھیں اور گوشت خور، بڑی بڑی سیاہ رنگ کی چیونٹیاں بھی اپنا کھا جا خوب وصول کر رہی تھیں۔ لاش متعفن ہو چکی تھی اور میں وہاں چند منٹ سے زیادہ کھڑی نہ رہ سکی۔ میری آنکھوں میں شوکی ناگا جیسے شخص کا یہ بھیاںک انجام دیکھ کر آنسو آ گئے۔ دونوں شکاری بھی غم زدہ تھے ایک تو اس وجہ سے کہ ان کے تین ساتھی اس درندے نے مار ڈالے تھے اور چوتھا شوکی ناگا تھا۔ بہر حال میں نے ان سے کہا کہ وہ لاش کے اوپر خشک پتے اور شاخیں ڈال دیں۔ اس سے زیادہ اور کچھ بھی نہ کیا جاسکتا تھا۔ یہ کہہ کر میں واپس مڑی اور اسی لمسے ایک دل دوزخ فضا میں گونجی۔ یہ چیخ ان دونوں آدمیوں میں سے کسی ایک کے حلق سے نکلی تھی۔ میں نے دیکھا ایک شکاری گھاس میں گرا ہوا بڑی طرح تڑپ رہا ہے اور دوسرا بھاگ کر پرے جا کھڑا ہوا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس صورت حال کا جائزہ لینا چاہا، لیکن دوسرے شکاری نے چلا کر مجھے پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا۔ اگر میں پیچھے ہٹنے میں چند سیکنڈ کی بھی تاخیر کرتی تو آج یہ داستان لکھنے کے لیے دنیا میں نہ ہوتی۔

کیا دیکھتی ہوں کہ ایک زبردست سیاہ ناگ نے گھاس میں سے اپنا پھن باہر نکالا اور گرے ہوئے شکاری کے اوپر جھومنے لگا۔ اس کے پھن کی چوڑائی ایک فٹ سے کسی طرح کم نہ ہوگی اور اندھیری رات کی طرح اس کا رنگ تھا۔ سیاہ پھن پر دو ننھی ننھی سفید آنکھیں کوڑیوں کی مانند چمک رہی تھیں۔ وہ بار بار سرخ لمبی زبان نکال کر گرے ہوئے شکاری کو ڈنگ مارتا اور پھر پھن لہراتا ہوا جھومنے لگتا۔ اس مہیب ناگ کو دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ اس کا کاٹا ہوا توپانی بھی نہ مانگا کرتا..... میں نے کمر سے بندھا ہوا ریوا لور نکالا اور احتیاط سے ناگ کے پھن کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ گولی صحیح جگہ لگی، پھن میں سے خون اگلنے لگا۔ ناگ وہیں شکاری کی لاش پر گر کر اور تھوڑی دیر تک ادھر ادھر زخمی پھن جھٹکنے کے بعد مر گیا۔

سانپ کے ختم ہونے کے بعد میں نے جھک کر مرے ہوئے شکاری کا جائزہ لیا۔ اتنی ہی دیر میں اس کا پورا بدن نیلا پڑ چکا تھا۔ گردن کی رگیں اتنی پھول چکی تھیں جیسے ابھی پھٹ جائیں گی۔ آنکھیں حلقوں سے اُبل پڑ رہی تھیں اور ہونٹوں کے دونوں کناروں سے زردی مائل رقیق مادہ سا بہہ رہا تھا۔ میں نے اس کی نبض ٹٹولی۔ اس بے چارے میں زندگی کی معمولی سی رمت بھی موجود نہ تھی۔ چار آدمی جنگل میں عین میری آنکھوں کے سامنے مارے جا چکے تھے اور اب میرے علاوہ ایک آدمی رہ گیا تھا۔ اس احساس ہی سے کلیجہ پھٹنے لگا کہ کیا ہم دونوں بھی زندہ سلامت اس بھیانک جنگل سے نکل کر بستی تک پہنچ پائیں گے یا راستے ہی میں ہلاک ہو جائیں گے۔

ایک بار پھر میں نے شوکی ناگ کی لاش کا معائنہ کیا اور اس مرتبہ یہ انکشاف ہوا کہ اس کی موت شیر کے باعث واقع نہیں ہوئی، بلکہ ادھر سے گزرتے ہوئے اسی مہیب سانپ نے اسے ڈسا اور جب شوکی ناگ مر گیا تب جنگلی جانوروں نے اس کے گوشت، خون اور ہڈیوں سے اپنی بھوک پیاس بجھائی۔ سورج اب غروب ہونے کی تیاریاں مکمل کر چکا تھا اور ہمیں جلد سے جلد بستی میں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ چنانچہ میں نے ڈرے اور سب سے ہوئے شکاری سے کہا کہ وہ راہبری کے فرائض انجام دے اور جس قدر جلد چل سکتا ہو، اتنا جلد راستہ طے کرے، ورنہ زندہ بچ کر یہاں سے جانا محال ہوگا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس آخری شخص نے اپنے اوسان خطا نہ ہونے دیے۔ اسے راستوں کے پیچ و خم سے بھی اچھی آگاہی تھی اور اگرچہ اندھیرا بڑی سرعت سے ہر شے کو اپنی پلٹ میں لے رہا تھا۔ تاہم بستی کے آثار ہمیں دور سے ہی نظر آنے لگے۔ جلتی ہوئی مشعلوں نے ہمیں بتایا کہ اب ہم خطرے سے باہر نکل چکے ہیں۔ بستی میں لوگ ابھی تک ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جب چار شکاریوں اور شوکی ناگ کے مارے جانے کی بری خبر بستی والوں کو دی گئی تو ان کا کیا حال ہوا۔ کوئی آنکھ اسی نہ تھی جو اٹھک بار نہ ہوا اور کوئی دل ایسا نہ تھا جس سے آپس نہ اٹھ رہی ہوں۔

میں دن بھر کی تھکی ماندی تھی، اس لیے بستر پر لیٹنے ہی غفلت کی گہری نیند سو گئی۔ یکا یک اپنے مکان کے ارد گرد خوفناک آوازوں کے بلند ہونے سے آنکھ کھل گئی۔ احساس ہوا کہ مکان کے نیچے کوئی جانور لکڑی کے وہ ستون اپنے دانتوں اور پنجوں سے اُڑھنے کی کوشش کر رہا ہے جو مکان کو سہارا دینے کے لیے بنائے گئے تھے۔ وہ کوئی زبردست شیر یا چیتا تھا۔ وہ کبھی زور سے گرجتا اور کبھی ہلکی ہلکی سی آوازیں غرائے لگتا۔ یقیناً وہ بھوکا تھا اور اب غذا کی تلاش اسے یہاں تک لے آئی تھی۔ میں نے آہستہ سے سر ہانے رکھی ہوئی رائفل اٹھائی اور دبے پاؤں بستر سے نکل کر کھڑکی کی طرف گئی۔ کھڑکی کا پردہ ہٹا کر میں نے باہر جھانکا تو پہلے تو کچھ نظر نہ آیا، پھر ایک قدر آدھر شیر کا ہیولا سا دکھائی دیا۔ وہ اس جھوپڑی کے نزدیک کھڑا تھا جہاں ہم اپنے شکاری کتے باندھا کرتے تھے۔ دونوں کتے جنگل میں مارے جا چکے تھے اور اب ہمارے گھر کی رکھوالی کرنے والا کوئی نہ تھا۔ میں نے خیال

کیا کہ شیر اس وقت کتوں کی بو پر آیا ہے اور اب یقیناً پوس ہو کر لکڑی کا ستون نوچ رہا ہے..... جی میں آیا کہ اس پر فائر کروں، مگر پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔ بستی کی جانب نگاہ دوڑائی تو فضا میں اجالا سا ہورہا تھا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ بستی والوں نے آگ کے الاؤ بڑی تعداد میں روشن کر رکھے ہیں اور یہ روشنی اس آگ کی تھی۔ یہ لوگ اگر الاؤ نہ جلائیں تو جنگلی درندے ان کا امن و سکون مستقل طور پر حرام کیے رکھیں۔ آگ کے ان الاؤں اور جلتی ہوئی مشعلوں کے باوجود گزشتہ شب ایک درندہ، مامیرا کو ہلاک کر کے چلا گیا تھا۔

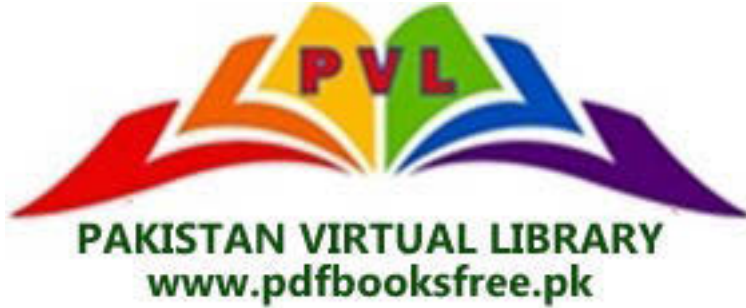
میں اپنے بستر پر واپس جانے ہی والی تھی کہ معائنہ کر سویا دیا..... دل فرط خوف سے دھک دھک کرنے لگا۔ بے اختیار میں نے کمر کو آوازیں دینا شروع کیں، لیکن جواب میں شیر کی آواز ہی سنائی دی۔ کمرودہاں نہیں تھا..... اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جھوپڑی کے اندر تھا۔ مجھے کمر پر تاؤ آنے لگا..... ولیم کے جانے کے بعد میں نے اسے سختی سے ہدایت کی تھی کہ وہ جھوپڑی میں مت سوتے، لیکن اس نے ایک نہ مانی..... یہ شیر یقیناً کرمو کی تاک میں تھا۔

ادھر میں نے شیر پر اندھا دھند فائر کیے، ادھر کمرودہ شیر کی ملی جلی چیخوں سے قیامت برپا ہو گئی۔ درندہ میری تاک کے عین نیچے سے کمر کو اٹھا کر لے جا چکا تھا۔ فائروں کی آوازیں بستی والوں کے کانوں تک بھی پہنچیں اور ادھر سے دس پندرہ آدمی ہاتھوں میں جلتی مشعلیں اور نیزے سنبھالے دوڑتے ہوئے آئے، لیکن اب ان کا آنا نہ اتنا براہر تھا۔ گیا ہوا کمرودہ اپس نہ آ سکتا تھا۔ اس کی موت پر میں بڑی طرح روئی۔ وہ ہمارا نہایت پرانا اور خدمت گزار ملازم تھا۔

اگلے روز میں ہاتھی پر سوار ہو کر نزدیکی قصبے گئی اور ولیم کو فوراً واپس آنے کا تار دیا۔ دو گھنٹے انتظار کرنے کے بعد اس کا جوابی تار آیا۔ اس میں درج تھا کہ وہ فوراً آ رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی ولیم نے مجھے ہدایت کی تھی کہ میں جنگل کے اندر نہ جاؤں۔ مگر کمرودہ، مامیرا اور شوکی ناگ کی اموات نے غم و غصے سے میرا برا حال کر دیا تھا۔ ولیم کے انتظار کی تاب ہی نہ تھی اور میں یوں بھی اسے دکھانا چاہتی تھی کہ جو کام مرد کر سکتے ہیں، وہ عورتیں بھی بخوبی کر کے دکھا سکتی ہیں۔ دن کا بڑا حصہ میں نے کرمو کی تلاش میں گزارا، لیکن آدم خور اسے مکان سے دور نہ لے گیا تھا۔ مشکل سے وہ سو گز دور گیا ہوگا کہ بھوک نے اسے آگے جانے سے روکا۔ اس نے وہیں ایک درخت کے نیچے کرمو کی لاش میں سے کچھ حصہ ہڑپ کیا اور اسے جھاڑیوں میں چھپا کر چلا گیا۔ میں نے کرمو کی لاش وہیں پڑی رہنے دی اور رات اس درخت پر شیر کا انتظار کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ یہ یقینی بات تھی کہ رات کسی وقت شیر دوبارہ کرمو کی لاش پر آئے گا۔ سرشام ہی میں نے تیاریاں مکمل کیں اور ضروری سامان سے لیس ہو کر درخت پر چڑھ گئی۔ پایوں کہیں کہ مقامی باشندوں نے مجھے درخت پر چڑھنے اور شاخوں کے اندر چھپ کر اطمینان سے بیٹھنے میں مدد دی۔

جب سب لوگ چلے گئے اور جنگل پر ہوکا عالم طاری ہوا تو میرے اعصاب جھنجھٹا اٹھے۔ گیدڑوں اور بندروں کی ملی جلی آوازیں ایک مرتبہ شروع ہوئیں تو پھر ختم ہونے میں نہ آئیں۔ ان آوازوں سے بہر حال ایک فائدہ ضرور پہنچتا ہے اور وہ یہ کہ درندے کی آمد کا بروقت علم ہو جاتا ہے۔ درخت یا چٹان پر بے حس و حرکت گھنٹوں بیٹھنا سہل نہیں۔ یہ بے حد تکلیف وہ عمل ہے جس میں سب سے زیادہ زور اعصاب پر پڑتا ہے اور بعض اوقات شکاری فریب نظر کا شکار بھی ہو جاتا ہے۔ میں نے پھمروں اور خونخوار چیونٹیوں سے محفوظ رہنے کے لیے بدن پر بدبودار خاص قسم کا محلول مل لیا

تھا۔ شیر کے تفصیلی معائنے سے یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ گیا کہ اسی نے مامیر کو مارا تھا اور بعد ازاں یہی درندہ کرمو کو جھونپڑی میں سے اٹھا کر لے گیا۔ جنگل میں جو شیر ہلاک ہوا تھا، وہ آدم خور تو نہ تھا۔ تاہم اس نے تین مقامی باشندوں کو جس تیزی اور تندی سے دست بدست جنگ کے بعد مارا، وہ بجائے خود ناقابل معافی جرم تھا۔ صبح صادق کی روشنی مشرقی افق پر پھوٹ رہی تھی جب ہمارا قافلہ آدم خور شیر کی لاش اٹھائے بستی کے اندر داخل ہوا اور اس لمحے میں نے پہلی بار مامیرا کی ماں کے ہونٹوں پر وہ مسکراہٹ دیکھی جو اس حقیقت کی غماز تھی کہ ایک عورت کے خون کا بدلہ ایک عورت ہی نے لیا اور اس طرح مرد پر ثابت کر دیا کہ عورت بھی جنگل کی حکمران بن سکتی ہے۔



تھا۔ اس کے باوجود چمچروں اور چوہنیوں نے مجھے بڑا پریشان کیا۔ آدھی رات گزر چکی تھی اور آدم خور شیر کا دور تک نام و نشان نہ تھا۔ میں نے محکم دور کرنے کے لیے قمراس میں سے گرم گرم قبوہ نکال کر پیا اور تازہ دم ہو گئی۔ یکا یک میں نے کچھ فاصلے پر عجیب سی آہٹ سنی۔ دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ میں نے آہستہ سے قمراس ایک طرف رکھا اور رانفل اٹھائی۔ آنکھیں اندھیرے سے خاصی مانوس ہو چکی تھیں۔ تاہم فور سے دیکھنے کے باوجود مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں صبر و استقلال سے اسی آواز کی دوبارہ منتظر رہی اور جیسا کہ توقع تھی، تھوڑی دیر بعد وہی آہٹ دوبارہ سنائی دی، مگر اس مرتبہ قریب سے آئی تھی۔ یوں لگا جیسے درندہ پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا ہو۔ میں اپنے بدن کو حرکت دینے بغیر محض گردن کی جنبش سے اپنے ارد گرد دیکھ رہی تھی اور پھر میری نگاہوں سے وہ چھپا نہ رہ سکا۔ درخت کے عین سامنے طویل فاصلے تک پھیلی ہوئی قد آدم جھاڑیوں کے اندر دو مشعلیں روشن تھیں جو وقفے وقفے سے دائیں بائیں اور آگے پیچھے حرکت کر رہی تھیں۔ میں نے وقت ضائع کیے بغیر ان دونوں آنکھوں کے درمیانی حصے کا نشانہ لیا اور لہلی دہادی۔ فائر کا دھماکہ ہوا اور وہ دونوں روشن مشعلیں غائب ہو گئیں۔ میرا خیال تھا یہ اگر شیر یا چیتا ہے اور زخمی ہو چکا ہے تو گرج گرج کر آسمان سر پر اٹھالے گا، لیکن خلاف توقع کسی شیر یا چیتے کی آواز جنگل میں نہ گونجی۔ مجھے شبہ ہوا کہ شاید میں فریب سمجھ رہا ہوں اور حقیقت میں میں نے کوئی آواز سنی نہ کسی کی روشن روشن آنکھیں دیکھیں۔

کوئی پندرہ منٹ بعد طے شدہ منصوبے کے عین مطابق بستی کی طرف سے دس بارہ مسلح آدمی ہاتھوں میں مشعلیں تھامے ادھر آئے۔ انہوں نے مجھے درخت سے اتارا۔ میں نے سب ماجرا بیان کیا۔ میری نشاندہی پر وہ لوگ جھاڑیوں میں گئے۔ وہاں بے شک کسی جانور کا خون بکھرا ہوا تھا، مگر وہ جانور وہاں موجود نہ تھا۔ البتہ فاصلے پر وہ ہمیں پڑا ہوا دکھائی دیا، اسے دیکھتے ہی میری ہنسی نکل گئی۔ وہ آدم خور شیر کی خالہ، ایک جنگلی بلی تھی اور میری رانفل کی گولی نے اس کی کھوپڑی پاش پاش کر ڈالی تھی۔ بہر حال، مجھے اپنے نشانے پر اعتماد ضرور ہو گیا۔ چونکہ اب جنگل میں خاصا غلاظہ بچ رہا تھا، اس لیے یہ بات کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ آدم خور اچانک نکل آئے گا۔ ہم سب بستی کی طرف واپس جا رہے تھے کچھ فاصلے پر جھاڑیوں میں سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی درندہ آہستہ آہستہ ہانپ رہا ہو۔ یہ آواز سنتے ہی سب چوکے ہو گئے۔ میں نے رانفل کندھے سے اتار کر ہاتھ میں لے لی۔ جھاڑیوں کے اندر یقیناً کوئی ڈی روح چھپا ہوا تھا اور اس نے ہمیں پیچھلی خبردار کر دیا تھا۔ یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس کی قضا سر پر کھیل رہی تھی اور خود مجھے احساس نہ تھا کہ یہ شکار کس قدر آسان ثابت ہو گا۔

مقامی آدمیوں نے اپنے نیزے جھاڑیوں کے اندر تاک تاک کر پھینکے۔ یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی۔ شیر غیض و غضب کی تصویر بنا اپنی کہیں گاہ سے برآمد ہوا۔ اسی لمحے میری رانفل نے بیک وقت دو شعلے اگلے اور اس کے ساتھ ہی پانچ چھ نیزے ان جنگلی قبائلیوں کے بازوؤں سے چھوٹے اور شیر کے جسم میں گڑ گئے۔ دونوں گولیوں میں سے ایک گولی اس کی پیشانی پر لگی اور دوسری پیٹ میں۔ شیر ہولناک دہاڑ کے بعد الٹ کر زمین پر گرا اور مایہ بے آب کی طرح ترپنے لگا۔ قبائلیوں نے رہے سہے نیزے بھی اس کے بدن میں اتار دیئے اور اس سے پیشتر کہ میں تیسرا فائر کروں، انہوں نے کلہاڑے سے مار مار کر شیر کی ہڈیوں کی کھا ڈالی۔

یہ میری زندگی کا پہلا آدم خور تھا جسے میں نے زمین پر کھڑے کھڑے ہلاک کیا، اگرچہ اس کی ہلاکت میں مقامی باشندوں کا بھی بڑا حصہ

جنگلی سور کا شکار

صاحب! صاحب! کالائنگز!..... چار کتے مر گئے ہیں..... اس پر گولی اڑ نہیں کرتی۔“ شکر نے یہ الفاظ بڑی طرح ہانپتے ہوئے کہے۔ جانے کہاں سے دوڑا رہا تھا۔ ذرا مظہر کر لیکن بدستور خوف زدہ کی کیفیت میں اس نے مجھے بتایا کہ آج صبح چند فوجی سپاہی پاس کے گاؤں میں آئے تھے، انہوں نے گاؤں کے آدمیوں کو ساتھ لیا اور جنگلی سور ختم کرنے کی مہم شروع کر دی۔ گیہوں کے کھیت میں شبہ ہوا کہ سور چل رہا ہے۔ فوجی کھیتوں کے ارد گرد پھیل گئے اور دیہاتیوں کو غل چانے کو کہا۔ بہت سے دیہاتی کھیت میں داخل ہوئے اور ہنکار شروع کر دیا۔ ایک سیاہ رنگ کا بڑا سا سور لینے لینے اٹھ بیٹھا اور اس نے ایک دیہاتی پر حملہ کر دیا۔ وہ آدمی کئی فٹ ہوا میں اچھلا۔ اس کی چیخ سنائی دی پھر وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ چند ایک آدمیوں کی نگاہ سور کی جسامت اور رنگ پر پڑی تو سب چیخے چلاتے ہوئے کھیت سے بھاگ اُٹھے۔۔۔ ”کالائنگز! کالائنگز!“ سور کھیت سے نکل کر ایک فوجی سپاہی پر حملہ کرنے کو بھاگا۔ فوجی کے پاس اچھی بھلی بندو قتی لیکن وہ گھبرا کر پیٹھ کے بل گر پڑا۔ البتہ گرتے گرتے گولی چلا دی جو سور کو تو لگی لیکن اس کے اپنے افسر کی ٹانگ کے پار ہو گئی۔ یہ میجر قریب ہی کہیں کھڑا تھا۔

فوج کے سپاہی اپنے زخمی میجر کو اٹھا کر شکار سے منہ موڑ گئے اور جاتے جاتے دیہاتیوں سے کہہ گئے کہ اگر تم لوگ اس سور کو ہلاک کر دو تو تمہیں انعام ملے گا۔ کالا سور ان سپاہیوں سے ڈرے بغیر اطمینان سے چلا ہوا نشیب میں اتر کر نظروں سے غائب ہو گیا۔ یہ واقعہ صبح کے دس بجے پیش آیا۔ موقع پر ایک سو کے لگ بھگ دیہاتی کلہاڑیوں اور لاشیوں سے مسلح موجود تھے۔ اور دو کے پاس تو بارہ پور کی بندو قتی تھیں۔ ان کے درمیان طے پایا کہ اس درندے کو آج ختم کر کے ہی دم لو۔ چنانچہ بندو قتوں سے مسلح افراد کو جنگل میں بھیجا گیا اور دیہاتی خود باہر کھڑے شور کرتے رہے لیکن بندو قتوں والے دونوں آدمیوں کو جنگل میں گھسنے کی جرات نہ ہوئی۔ ان کے کتے شکار کے تعاقب میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد کتوں کی چیخیں سنائی دیں اور پتہ چلا کہ کالے سور نے چار کتوں کو ہلاک کر دیا ہے اور باقی زخمی ہو کر ادھر ادھر بھاگ گئے تھے۔

اس واقعہ کی اطلاع مجھے ساڑھے تین بجے شام کو ملی۔ فردری کا مہینہ تھا۔ سردی اچھی خاصی تھی۔ مجھے اپنے دوست موہن کے گاؤں آئے دس روز ہو چکے تھے۔ وہ کھیا کا بیٹا تھا جب میں پہلے روز گاؤں آیا تھا تو موہن نے بتایا تھا کہ ایک کالے رنگ کے سور نے بڑا اودھم مچا رکھا ہے۔ موہن کے بیان کے مطابق اس کی اگلی ٹانگ خود موہن کی گولی سے زخمی ہوئی تھی اور اب وہ لنگڑا ہو گیا تھا۔ قد و قامت کے لحاظ سے بھی یہ سور دوسرے سے بہت بڑا تھا۔ چند ہفتوں سے اس نے قیامت برپا کر رکھی تھی اور کئی آدمیوں کو ہلاک اور زخمی کر چکا تھا اسے ہلاک کرنے کی بہت کوششیں کی گئیں لیکن سب ناکام رہیں۔ ایک ہندو تھانے دار کا بیٹا تلوار لے کر اس درندے کو ہلاک کرنے گیا تھا لیکن پھر جنگل میں اس کی چیخ و پکار سنائی دی، جا کے دیکھا تو وہ زخمی پڑا تھا۔ سور کا کہیں نام و نشان نہ تھا اور اس شکاری کی تلوار بھی لاپتہ تھی۔

میری بھی اس سے ملاقات ہوئی۔ بلا مبالغہ ساڑھے چھ فٹ قد کا پہلوان نما آدمی تھا۔ مجھ سے بڑی حقارت سے مخاطب ہوا (اس کے تن و توش کے لحاظ سے میں بالکل بچہ معلوم ہوتا تھا) اس نے پوچھا۔ ”کیا تم نے اس سے پہلے کبھی جنگلی سور دیکھا بھی ہے؟“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ جنگلی سور کی مرتبہ دیکھ چکا ہوں، اب اسے بھی دیکھ لوں گا۔ موہن کو اس کا لہجہ بڑا لگا اور اس نے قدرے غصے سے کہا۔ ”یہ شکاری ہیں اور ابھی چند ماہ چیتر شیر کو ہلاک کر چکے ہیں۔“ یہ سن کر اس نے مجھے عجیب نظروں سے دیکھا اور کہنے لگا۔ ”اٹھا رہس کے لڑکے سے یہ توقع نہیں رکھی جاسکتی کہ وہ اس کالے سور کو مارے گا۔ بہتر ہے کوشش نہ کرنا۔“

اس درندے کے متعلق چند باتیں مشہور تھیں۔ مثلاً یہ کہ اس نے جنگل میں ایک قلعہ مخصوص کر رکھا ہے اور کوئی آدمی اس قلعے میں داخل نہیں ہو سکتا۔ دوسری حیرت انگیز بات یہ بھی مشہور تھی کہ اگر کسی نے زور سے کہہ دیا کہ ”کالائنگز! جا رہا ہے“ تو وہ باہر نکل آتا تھا اور وہ اس آدمی کو ہلاک کر دیتا تھا اور بعض تو یہ بھی کہتے تھے کہ وہ کوئی شر شرار یا کسی ظالم بادشاہ کی بدروح ہے۔

میرے نزدیک یہ شخص مبالغہ اور وہم تھا، میں دوسرے دن ہی قلعہ نما جنگل میں داخل ہو گیا۔ واقعی جنگلی سوروں کے لیے اس سے زیادہ مناسب آرام کی جگہ ملنا مشکل تھی۔ گھسنے گھسنے پانی، دلدل میں گھسی جھاڑیاں اور دب کے اونچے اونچے پودے تھے۔ ایک قدم بھی چلنا محال تھا۔ میں تقریباً دو گھنٹے وہاں گھومتا رہا لیکن کالے لنگڑے سے ملاقات نہ ہو سکی اور واپس آ گیا۔ اگلی صبح موہن کو ساتھ لے کر دریا میں مرغابیوں کے شکار کے لیے چلا گیا۔ 12 بجے تھک کر لوٹ آئے تو معلوم ہوا کہ کالے لنگڑے نے گاؤں کے ایک اور نو جوان کو زخمی کر دیا ہے اور نو جوان بے ہوش ہے، میں اسے دیکھنے چلا گیا۔ دیہات کی عورتیں اور بچے سب وہاں جمع تھے۔

زخمی کو دیکھا تو پتہ چلا کہ تقریباً تمام جسم پر گہرے زخم ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ہوش میں آ کر اس نے آنکھیں کھولیں تو چیخنے لگا۔ وہ آیا۔ وہ آیا۔ میں مر گیا۔ پچاؤ۔ پچاؤ۔ اس کی آنکھیں لال سرخ ہو رہی تھیں۔ میں نے زخمی کو ہسپتال جانے کا مشورہ دیا اور خود دل ہی دل میں عہد کرتا ہوا لوٹ آیا کہ ایک ہفتے کے اندر اندر لنگڑے کو ختم کر دوں گا۔ زخمی کے چھوٹے بھائی سے معلوم ہوا کہ حسب معمول دونوں بھائی کھیت میں گھاس لینے گئے جب کھیت میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ کالائنگز تقریباً بیس گز کے فاصلے پر جا رہا تھا۔ زخمی ہونے والے جوان نے شور کر دیا۔۔۔ ”کالائنگز! کالائنگز!“

لنگڑے سور نے رخ بدل لیا اور چنگھاڑ کر حملے کے لیے دوڑا اور ذرا سی دیر میں اس نے اس آدمی کی ہڈی پھلی ایک کر دی اور پھر مزے سے چلا ہوا پناہ گاہ میں داخل ہو گیا۔ اس وقت اور بھی چند آدمی وہاں موجود تھے لیکن اس منظر کو دیکھ کر سب اس قدر دہشت زدہ ہو گئے اور کچھ بھی نہ کر سکے اور اپنی جانیں بچانے کی فکر میں رہے۔

دوسرے ہی دن میں نے ڈبل بیرل گن سنبھالی اور لنگڑے کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں کسی حد تک خوف زدہ بھی تھا۔ سارا دن کھیتوں اور جنگل میں گھومتا رہا لیکن کالائنگز نہ ملا۔ اسی طرح پانچ دن گزر گئے لیکن لنگڑے کی شکل نظر نہ آئی۔ کچھ ایسا شک ہونے لگا جیسے وہ چلا گیا ہے لیکن کبھی کبھی یہ خیال بھی بڑی طرح پریشان کرتا کہ جب اس سور کو اتنی تیز ہے کہ وہ کالائنگز اسنے ہی کہنے والے پر حملہ کر دیتا تو کیا یہ ممکن نہیں کہ مجھے دیکھ کر چھپ جاتا ہو اور کچھ لیتا ہو کہ یہ دیہاتی نہیں اور خاموشی سے دب جاتا ہو؟

چھنے روز میں نے تلاش ترک کر دی اور انتظار کرنے لگا کہ دیکھوں اب کب نظر آتا یا کسی پر حملہ کرتا ہے۔ لیکن اسی شام کو اطلاع ملی کہ کالا لنگڑا پھر دیکھا گیا ہے۔ میں فوراً بندوق لے کر جنگل کی طرف چل پڑا۔ اس کے چھپنے کی جگہ گاؤں سے تین میل دور تھی۔ بیچ میں گہری کھائی تھی اور چاروں طرف اونچے اونچے بندے یعنی اس کی پناہ گاہ کا علاقہ نشیب میں تھا۔ ایک میل دور سے ہی گولیاں پلنے کی آواز میرے کانوں میں آنے لگی۔ پتہ چلا کہ کچھ لوگ صبح سے کالے لنگڑے کے پیچھے لگے ہوئے ہیں لیکن کوئی گولی اس پر اثر نہیں کرتی وہ سامنے آتا ہے اور جب اس پر گولی چلتی ہے تو بڑے اطمینان سے جنگل کی طرف چلا جاتا ہے۔ وہاں پہنچا، عجیب منظر دیکھا۔ بلند جگہ پر تقریباً ڈیڑھ سو آدمی کھڑے شور مچا رہے تھے۔ کتے بھی پوری قوت سے ان کا ساتھ دے رہے تھے۔ نیچے نشیب میں دو آدمی بندوقیں تھانے کھڑے سامنے جھاڑیوں میں فائر کر رہے تھے۔ لوگوں نے مجھے بتایا کہ سور سامنے کی جھاڑیوں میں ہے۔ میں نے بلندی سے جائزہ لیا تو یہ بات واضح ہو گئی کہ درندہ جنگل میں ہو سکتا ہے، کیونکہ کتے اس کی بو پر پوری طرح بھوک رہے تھے لیکن جنگل کا یہ کلواکم ویش ایک مربع میل میں پھیلا ہوا تھا اور اس میں ایک درندہ کے کو تلاش کرنا آسان نہ تھا۔ شام بھی گہری ہونے والی تھی۔ میں نشیب میں اتر گیا اور ان دونوں شکاریوں سے فائرنگ بند کرائی۔ وہ اناڑی تھے جو کار توں چلا رہے تھے۔ حیرت ہے کہ اس کے بعد یہ فوجی پھر کبھی سور کے شکار کو نہ آئے۔ ایک ہی مہر کو فوجی کروا کر انہوں نے ساری مہم ترک کر دی تھی۔

میں محتاط ہو کر جھاڑیوں میں داخل ہو کر تقریباً پندرہ منٹ گھومتا رہا لیکن کچھ پتہ نہ چلا۔ میں نے موہن کے کتے کو بلا لیا، اس ایک کتے کو دیکھ کر اور کتے بھی اتر آئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد مجھے کسی کتے کی خوفزدہ سی بھونکنے کی آواز آئی۔ بھونکنے کا انداز بتا رہا تھا کہ کتا سخت خطرے میں ہے۔ میں بھاگتا ہوا کتے کی آواز کی طرف گیا لیکن پانی اور کچھڑ کی وجہ سے تیز چلنا آسان نہ تھا۔ میں دلدل سے نکل کر خشک زمین پر چلا گیا جہاں سرکنڈوں کی گھنی جھاڑیاں تھیں۔ اچانک کتے کی دلدوز چیخ سنائی دی اور کتا میرے سامنے ہوا میں کئی فٹ اوپر اچھلا اور گرا، پھر گھاگھونٹنے کے خزانے سنائی دیئے اور پھر خاموشی۔ کالا لنگڑا ایک اور کتے کو ختم کر چکا تھا۔

میں بہت تیزی سے آگے بڑھا لیکن اچانک رک گیا۔ بائیں ہاتھ پر کالا سور کھڑا تھا۔ اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ میں نے اطمینان سے نشانہ لیا، بلبلی دبانے ہی لگا تھا کہ دائیں طرف سے خوفناک پھنکار سنائی دی۔ میں نے گھبرا کر ادھر دیکھا، میری رگوں میں خون جم گیا۔ ایک سیاہ ناگ تقریباً چھ سات فٹ کے فاصلے پر کنڈلی مارے بیٹھا تھا اور آہستہ آہستہ پھن اٹھا رہا تھا۔ اس کے سر پر سفید سا (۷) کا نشان نظر آ رہا تھا۔ وہ شیش ناگ تھا جسے میں اچھی طرح جانتا پہچانتا تھا۔

غیبت یہ ہوا کہ سور نے مجھے نہ دیکھ لیا اور نہ مجھ پر حملہ کرتا دیتا۔ سانپ کو دیکھ کر میرا بندوق والا ہاتھ خود بخود ڈھیرا ہو گیا اور بندوق کندھے سے اتر کر بغل میں آ گئی۔ اس میں میرے ارادے کو قطعاً دخل نہ تھا۔ میں سور سے بالکل غافل ہو گیا اور ناگ کو دیکھنے لگا۔ اس وقت خوف کے مارے مجھے بھی شک ہونے لگا کہ یہ کالا لنگڑا کوئی شرشر یا بدروح ہے جس کی حفاظت کے لیے ناگ آ لگا ہے۔

ناگ نے ہلکی سی پھنکاری اور سر کو زمین سے بلند کر کے میری طرف دیکھا۔ میں کسی سحر زدہ کی طرح ناگ کی طرف دیکھنے لگا۔ ناگ چمن کو پھیلا کر آہستہ آہستہ اوپر اٹھ رہا تھا۔ تقریباً تین فٹ بلند ہو کر اس نے جسم سیدھا کیا۔ بار بار زبان کو باہر نکالتا اور اندر کرتا، جیسے ہر سانپ کیا کرتا ہے۔

میں ٹھٹکی باندھے اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ آہستہ آہستہ مجھ پر مدہوشی چھا گئی اور میں خود سے غافل ہو گیا۔ اب حالت یہ تھی کہ میں بغیر پلٹیں جھپکائے ناگ کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ معلوم نہیں کتنی دیر تک میں یوں ہی کھڑا رہا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا جسے کوئی قوت مجھے ناگ کی طرف دھکیل رہی ہے۔ اسی حالت میں میرا دایاں قدم اٹھا اور آگے بڑھ گیا جوں ہی قدم آگے بڑھا، ناگ نے جھوم کر پھن اور پھیلا یا اور پیچھے کی طرف سر ہٹا کر ترچھا ہو گیا اور پھر ایک خوف ناک پھنکار..... اور اس پھنکار نے میری جان بچائی۔ پھنکار سننے ہی ایسا معلوم ہوا جیسے میں سوتے میں چونک پڑا ہوں۔ اب تمام حالات تیزی سے دماغ میں گھوم گئے۔ ایک طرف سور کھڑا ہے اور دوسری طرف ناگ۔ میں درمیان میں کھڑا ہوں۔ آس پاس کوئی بھی نہیں، جو میری مدد کرے۔ میں اب ہوش میں تھا اور تیزی سے سوچ رہا تھا کہ پہلے سور کو ماروں یا ناگ کو دراصل کام دونوں مشکل تھے اور دونوں میں سے کوئی بھی مجھ پر حملہ کر سکتا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ پہلے ناگ کو ختم کر لوں کیونکہ یہ زیادہ خطرناک ہے لیکن مجھے یہ چیز خاصی پریشان کر رہی تھی اور اس سے پہلے تجربہ بھی ہو چکا تھا کہ اگر چھرے اکٹھے ناگ کی گردن میں لگیں گے تو ٹھیک ہے ورنہ پھیلے ہوئے چھرے اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے بلکہ وہ زخم کھا کر بھی پلک جھپکنے مجھ پر حملہ کر دے گا۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ میں اب ناگ کی آنکھوں میں نہیں دیکھ رہا تھا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میں اس سے نظریں چرا رہا تھا کیونکہ میری آنکھوں میں اتنی قوت ہی نہ تھی جو ناگ کی نگاہوں میں جھانکتا۔ اگر ناگ چاہتا تو بڑی آسانی سے مجھے ڈس لیتا کیونکہ میرے قدم بڑھانے سے اب فاصلہ اور کم ہو گیا تھا پھر اتنا وقت بھی نہ تھا کہ میں بندوق بغل سے نکال کر کندھے پر لاتا اور نشانہ لے کر گردن پر فائر کرتا۔ اس کے علاوہ یہ بھی خطرہ تھا کہ بندوق چلتے ہی ناگ حملہ کر دے گا۔

میرا جسم کانپنے لگا۔ بلبلی پر انگلی، میں بھی ارتعاش تھا۔ میں خود محسوس کر رہا تھا کہ اگر چند سیکنڈ کی بھی دیر ہوئی تو میں ختم ہو جاؤں گا۔ آخر ہمت کر کے میں نے فیصلہ کر لیا کہ پھر ناگ کی آنکھوں میں جھانکوں اور جب وہ میرے چہرے کی طرف تمام توجہ سے دیکھے تو آہستہ سے بندوق کا رخ اس کی طرف پھیر دوں۔ میں نے جھکی ہوئی پلکیں اٹھائیں، ناگ کی آنکھوں میں دیکھا۔ نگاہیں پلٹیں تو ناگ نے سسکاری سی لی۔ میرا رواں رواں کانپ اٹھا لیکن ہمت کر کے میں نے آہستہ سے ناگ کی طرف رخ موڑ دیا لیکن وہی ہوا جس کا خوف تھا، بندوق چلتے دیکھ کر ناگ نے زور سے پھنکاری، پھن تھوڑا پیچھے کیا اور حسرت کرنے کی پوزیشن لے لی۔ خوف سے میری سانس رک گئی۔ آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں اور معلوم نہیں کس طرح بلبلی دب گئی۔ ایک دھماکہ ہوا اور میری آنکھیں کھل گئیں۔ سانپ اچھل کر چار فٹ پیچھے جا کر اٹھا اور تڑپ رہا تھا۔ گردن آدمی سے زیادہ اڑ گئی تھی۔ شاید میں نے ہوش میں ہی فائر کیا تھا لیکن کچھ یاد نہیں۔

اسی لمحہ سوری آواز سنائی دی۔ میری پیٹھ اس کی طرف تھی، خدا جانے مجھ میں اتنی قوت اس وقت کہاں سے آ گئی کہ میں نے کھڑے کھڑے چھلانگ لگائی اور کئی فٹ دور جا گرا۔ چھلانگ نے میری جان بچائی۔ سور نے حملہ کر دیا تھا لیکن وار خانی گیا۔ وہ آگے نکل گیا۔ اب میں چونکا تھا۔ میں نے کھڑے ہونے کی کوشش کی لیکن ناگیں تو اب بھی ناگ کی دہشت سے کانپ رہی تھیں۔ میں نے بیٹھے بیٹھے سوری طرف دیکھا جو گھوم کر مجھ پر دوبارہ حملہ کرنے آ رہا تھا۔ میں نے بندوق کا نہ ہرے پر رکھ کر نشانہ لے لیا، جوں ہی سور کا منہ میری طرف مڑا میں نے آنکھ پر فائر کر دیا۔ چھروں کا

دیوبان کا آدم خور چیتا

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اپنے تار میں مجھ سے انسانیت کے نام پر اپیل کی کہ میں فوری طور پر دیوبان روانہ ہو جاؤں اور وہاں کے باشندوں کو اس بلائے بے درماں سے نجات دلاؤں جو ایک آدم خور چیتے کی شکل میں ان پر نازل ہو گئی ہے۔

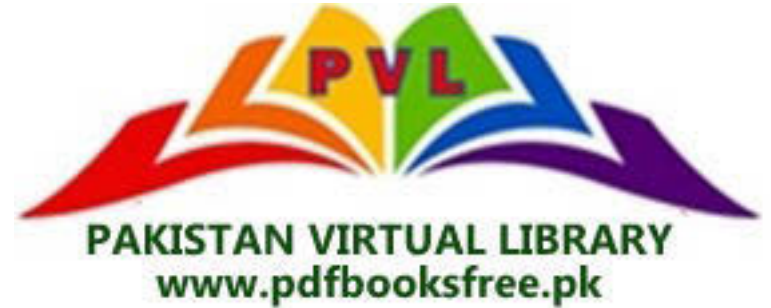
میں نے اپنے کیمپ کا ساز و سامان اسی روز اپنے ملازموں کے ہمراہ دیوبان روانہ کر دیا۔ اگلے روز میں خود بھی دیوبان پہنچ گیا۔ دیوبان پہنچ کر ابھی میں اپنے گھوڑے کی پیٹھ سے اترنے بھی نہ پایا تھا کہ روٹنے پینے کی بلند اور رنجیدہ صداؤں نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کرائی۔ دیوبان وسطی ہندوستان (سی پی) کی اُجڑی بھڑی اور بھری پہاڑیوں کے دامن میں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ ان پہاڑیوں پر جا بجا کانٹے دار جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ جگہ جگہ غار موجود تھے جہاں درندے آسانی سے پناہ لے سکتے تھے۔ دیوبان کے ارد گرد دو دو چار چار میل کے فاصلے پر اسی قسم کے کچھ اور بھی دیہات تھے جن میں کچھ مکانات تھے بلکہ زیادہ تر گھاس پھوس اور بانس سے بنائی ہوئی جمبوڑیاں تھیں۔ ان دیہات میں کول قوم کے لوگ آباد تھے جو تمام تر ان پڑھ اور تہذیب و تمدن سے نا آشنا تھے۔ یہ لوگ بھیڑ بکریوں کے ریوڑ رکھتے یا معمولی کھیتی باڑی کر کے اپنا پیٹ پالتے تھے۔

میرے دریافت کرنے پر میرے ملازمین نے مجھے بتایا کہ آج صبح یہاں سے کوئی ایک میل دور بکریاں چرانے والی ایک بیوہ عورت کے دس بارہ سالہ بچے کو ایک چیتا اُٹھا کر لے گیا اور ابھی تک اس کا کوئی پتہ نہیں چل سکا۔ میں نے گھوڑے کو یوں ہی چھوڑا اور اسی وقت گاؤں کے اندر چلا گیا وہاں مرد عورتوں اور بچوں کا ایک جھوم جمع تھا اور یہ سب لوگ بے اختیار رو رہے تھے۔ ان میں سب سے بلند رونے کی آواز اس عورت کی تھی جو چیتے کا شکار ہونے والے لڑکے کی ماں تھی۔ میرے وہاں پہنچتے ہی ان لوگوں نے مجھے گھیر لیا اور مجھے سے فریاد کی کہ میں اس چیتے کا کھوج لگا کر اسے اپنی گولی کا نشانہ بناؤں۔ میں نے ان لوگوں سے کہا کہ وہ پہلے رونا دھونا بند کر دیں اور پھر مجھے بتائیں کہ یہ واقعہ کب اور کیسے رونما ہوا۔ میری ہدایت پر وہ لوگ کچھ چپ ہوئے لیکن لڑکے کی ماں پھر بھی رو رہی تھی اور کسی طرح خاموش ہونے میں نہ آ رہی تھی۔

اس غم ناک حادثے کا معنی شاید اسی گاؤں کا کوئی سولہ سترہ سال کا ایک نوجوان تھا جو اس لڑکے کے ہمراہ خود بھی بکریاں چرا رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ میں اور وہ لڑکا آج صبح یہاں سے ایک میل پرے بکریاں چرانے کے لیے گئے۔ ہم لوگ بکریاں چرا رہے تھے کہ لڑکے کو پیاس محسوس ہوئی اور وہاں سے چند قدم کے فاصلے پر واقع تالاب سے پانی پینے کے لیے چلا گیا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ قریبی جھاڑیوں میں سے ایک چیتا نکلا اور بکریوں کے ریوڑ میں سے گزرتا ہوا لڑکے کی طرف بڑھا۔ میرا بھی تک یہ خیال تھا کہ وہ بکری اُٹھائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس نے کسی بکری کو نہیں چھیڑا بلکہ لڑکے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ میرے دیکھتے دیکھتے اس نے لڑکے پر چھلانگ لگا دی جو حالات سے بے خبر تالاب کے کنارے پر بیٹھا ہوا پانی پینے میں مصروف تھا۔ اس کی گردن پکڑی اور لڑکے کو گھسیٹا ہوا جس طرح سے آیا تھا، اسی طرح واپس جھاڑیوں میں گھس گیا۔ یہ واقعہ کچھ اتنی تیزی

مگروپ آنکھ میں سے گزر کر کھوپڑی میں چلا گیا۔ سو رہیں پیٹھ کر چنگھاڑنے لگا۔ یہ میری فتح کی علامت تھی لیکن پھر بھی احتیاطاً میں نے خالی کارٹوس نکال کر دو نئے بھردیے لیکن سو نہ اُٹھ سکا۔ اس کی چیخوں نے کتوں کو متوجہ کر لیا تھا اور اب سارے کتے اس پر پل پڑے تھے۔ دیہاتی بھی بھاگے آ رہے تھے۔ میں پھر ناگ کی طرف متوجہ ہوا، اس نے سر پٹختا بند کر دیا تھا البتہ اس کا پچھلا حصہ اب بھی ہل رہا تھا۔ اتنی دیر میں سب لوگ پہنچ گئے اور جب وہ میرے قریب آئے اور سانپ کو دیکھا تو ایک دیہاتی نے لکڑی ہلٹے ہوئے ناگ پر ماری۔ مجھے ایک سپیرے کی بات یاد آگئی تو میں نے دیہاتی کو وہ لکڑی پھینک دینے کو کہا۔ اس نے عجیب نظروں سے دیکھا اور لکڑی پھینک دی۔ لکڑی کا ایک سراسنپ پر گرا۔ دوسرے ہی لمحے لکڑی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ یہ شیش ناگ تھا۔

دیہاتی کا لے لنگڑے کو گھسیٹ کر باہر لے گئے اور مردہ جسم پر لائیاں اور کلہاڑیاں مار مار کر خوش ہوتے رہے۔ سوائے میرے غار کے نشان کے باقی جسم بے داغ تھا۔ اس کے حملہ کرنے کے دانت اُٹھ اُٹھ اُچھ لے گئے اور اتہائی تیز تھے۔



سے پیش آیا کہ میں گھبراہٹ میں لڑکے کو اس خطرے سے خبردار بھی نہ کر سکا اور پھر مارے ڈر کے وہاں سے گاؤں میں بھاگ آیا۔

لوگوں نے مجھے مزید بتایا کہ اس درندے کو اس علاقے میں آنے ہوئے کوئی تین ماہ کا عرصہ گزر چکا ہے اور اس عرصے میں وہ چند رہ کے قریب مرد، عورتوں اور بچوں کی جانیں لے چکا ہے۔ اس کے حملوں کا زیادہ تر نشانہ وہ لوگ بنے جو رات کو اپنے کھیتوں میں سوئے ہوئے ہوتے تھے یا پھر جن کے مکان اور جھونپڑیاں جنگل کے کنارے واقع ہوتی تھیں۔ جھونپڑیوں کی گھاس پھوس اور مٹی سے بنی ہوئی دیواروں میں اپنے بچوں سے سوراخ کرنا، اس کے لیے کوئی مشکل کام نہ تھا۔ اس کا پہلا نشانہ ایک عورت تھی جو رات کو اپنے کنبے کے دوسرے افراد کے ہمراہ اپنی جھونپڑی میں سو رہی تھی۔ چیتا آیا۔ اس نے حسب معمول دیوار میں سوراخ کیا اور جھونپڑی میں داخل ہو گیا۔ پہلا انسان جو چیتے کے قابو آیا وہ یہی عورت تھی۔ چیتے نے اس عورت کا منہ اپنے منہ میں لینا چاہا تو عورت کے بال اس کے منہ میں آ گئے۔ اس نے عورت کو بالوں سے پکڑ کر باہر نکالنا چاہا، لیکن اس عرصے میں عورت جاگ اٹھی اور اس کی چیخ و پکار سے گھر کے دوسرے افراد بھی بیدار ہو گئے۔ چیتے نے گھبرا کر عورت کو چھوڑ دیا اور خود باہر نکل آیا۔ عورت کو اگرچہ اس نے بالوں سے پکڑا تھا، تاہم پھر بھی اس کے کئی دانت عورت کی کھوپڑی پر لگے۔ اس کے دانتوں کا زہر اس قدر مہلک ثابت ہوا کہ وہ عورت اگلے دن دوپہر کو فوت ہو گئی۔

چیتا اب تک حملے رات کی تاریکی میں کرتا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے روز روشن میں بکریاں چرانے والے لڑکے کو اپنا نشانہ بنایا تھا۔ دیوبان میں اس کی یہ دوسری واردات تھی۔ درندہ گاؤں کے لوگوں کی اطلاع کے مطابق اس کی وارداتوں کا زیادہ زور یہاں سے چھیل دورا جھارانا نامی گاؤں پر تھا جہاں اس کے ہاتھوں مرنے والوں کی تعداد چھ تک پہنچ چکی تھی۔

میں ان حالات کو سن کر اپنے کیمپ میں واپس آ گیا۔ میرے گھوڑے پر زین ابھی تک کسی ہوئی تھی۔ میں نے اپنی رانفل سنبھالی اور اس نوجوان اور گاؤں کے چھ سات دوسرے آدمیوں کو اپنے ہمراہ لے کر لڑکے کی لاش کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ لڑکے کی ماں نے بھی ساتھ چلنے کی ضد کی چار گھنٹے گزر چکے تھے۔ مجھے گاؤں والوں کا غیر ہمدردانہ اور بزدلانہ رویہ دیکھ کر بے حد افسوس ہوا کیونکہ ان میں سے کوئی بھی اب تک لڑکے کی لاش کی تلاش میں نہیں نکلا تھا۔ ہم جلد ہی تالاب کے کنارے پہنچ گئے وہاں لڑکے کے ٹھیسے جانے کے آثار موجود تھے چنانچہ ان کی مدد سے ہمیں لڑکے کی لاش تک پہنچنے میں کوئی خاص وقت پیش نہ آئی۔ چیتے نے لڑکے کی لاش کو ایک خشک نالے میں ایک جھاڑی کے نیچے چھپا رکھا تھا۔ اس نے لڑکے کی ٹانگ کا کچھ حصہ کھا لیا تھا۔ باقی لاش موجود تھی لیکن اس کا حلیہ بڑی طرح گڑبگڑ چکا تھا۔

لاش کی حالت جیسی بھی تھی لیکن ماما کی ماری ماں نے اس کی کوئی پروا نہیں کی۔ وہ تیزی سے لاش کی طرف بڑھی پھر وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ لاش کو اٹھا کر اس نے اپنی گود میں رکھ لیا۔ کبھی وہ اس کا منہ چومتی اور کبھی دھاڑیں مار مار کر روتی۔ یہ دلدوز منظر دیکھ کر ہم سب متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور ہم سب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بلاشبہ ایسا دردناک منظر میں اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔ بہر حال میں نے اس عورت کو صبر کی تلقین کی اور بڑی مشکل سے اسے خاموش کرایا۔

میرا ارادہ تھا کہ میں آج رات کو لڑکے کی لاش کے قریب ایک مناسب درخت پر بیٹھ کر چیتے کا انتظار کروں۔ گاؤں کے لوگوں کے سامنے

جب میں نے اپنے اس ارادے کا اظہار کیا تو انہوں نے بڑی خوشی سے مجھے اس بات کی اجازت دے دی لیکن لڑکے کی ماں نے نہ مانی۔ میں نے اسے دس روپے (اس وقت کے تقریباً دو صد روپے) کا نوٹ بھی دینا چاہا اور یہ بھی بتایا کہ آج اس درندے سے انتقام لینے کا شاندار موقع ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میں اسے آج ہی ختم کر ڈالوں لیکن اگر وہ آج نہ مارا گیا تو اس امر کا خدشہ ہے کہ پھر گاؤں کا کوئی آدمی اس کا نشانہ بن جائے لیکن وہ عورت اتنی ضدی ثابت ہوئی کہ اس نے دس روپے قبول کیے اور نہ میری کسی دلیل پر کان دھرے۔ وہ بار بار رو کر کہہ رہی تھی کہ میرے بچے کو میرے گھر لے چلو، میں اسے یہاں کبھی نہیں چھوڑ دوں گی۔ بہر حال یہ ماں کی مامتا تھی اور اس میں اس کا کوئی قصور نہ تھا۔ عورت اپنے لڑکے کی لاش لے کر چلی گئی۔ اب چیتے کے انتظار میں میرا یہاں بیٹھنا لا حاصل تھا، پھر بھی میں چھپنے کے وقت تک وہاں بیٹھا رہا لیکن جیسی توقع تھی وہی ہوا، چیتا نہ آیا۔ میرا خیال ہے کہ یا تو اس نے مجھے وہاں دیکھ لیا یا پھر اس کی چھٹی جس نے اسے متوقع خطرے سے خبردار کر دیا تھا۔

رات کو کھانے کے بعد جلد ہی میری آنکھ لگ گئی۔ لیکن کوئی دو گھنٹے کے بعد ہی گیندروں کی مخصوص چیخ و پکار نے مجھے جگا دیا۔ گیندروں کا خوف زدہ آوازیں اس وقت نکالتے ہیں جب وہ کسی شیر یا چیتے کو جنگل میں چلتا پھرتا دیکھتے ہوں۔ میں اٹھ بیٹھا، اپنی بندوق سنبھالی اور کیمپ کا چکر لگانے کے لیے باہر نکل گیا۔ میں نے ماحول پر ایک نظر ڈالی، ملا زمین کو ہوشیار رہنے کی تلقین کی اور واپس آ کر سو گیا۔ رات بغیر کسی ناخوشگوار واقعہ کے گزر گئی۔ لیکن صبح میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ چیتا اس رات ایک دفعہ نہیں بلکہ دو دفعہ ہمارے کیمپ کے ارد گرد پھرتا رہا لیکن خیریت رہی۔

لڑکے کی موت کے بعد چند دن تک علاقے میں امن رہا لیکن ایک ہفتہ بعد بدقسمت موضع اجمارا سے یہ اطلاع موصول ہوئی کہ چیتا پھر وہاں ایک آدمی کو اپنا نشانہ بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ فیض آدمی رات گئے پیشاب کرنے کے لیے باہر نکلا تھا کہ پھر اس کو لوٹنا نصیب نہ ہوا۔ بد قسمتی سے چیتا اس وقت باہر موجود تھا، وہ فوری طور پر اس شخص پر حملہ آور ہوا اور اسے نیچے گرالیا۔ گرنے کی آواز سن کر اس کا ساتھی ایک چلتی ہوئی لکڑی کے لیے جھونپڑی سے باہر نکلا، اسے دیکھتے ہی چیتا فرار ہو گیا۔ یہ دوسرا موقع تھا کہ چیتا اپنے شکار کو یوں چھوڑ کر چلا گیا۔

چونکہ اس واقعے کی اطلاع مجھے کافی تاخیر سے ملی تھی۔ اس لیے میں نے موضع اجمارا جانا بے سود سمجھا اور دیوبان ہی ٹھہرا رہا۔ اب چاندنی راتیں شروع ہو گئی تھیں۔ ایک رات میں اور میری اہلیہ کیمپ کے باہر کرسیوں پر بیٹھے چاندنی کا لطف اٹھا رہے تھے کہ میں نے اپنے سامنے کھلے میدان میں ایک چیتے کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ میں فوراً پک کر اٹھا اور خیمے میں گھس کر پہلا ہتھیار نکال لایا جو ایک رانفل تھی جس سے میں رات کو شکار نہیں کر سکتا تھا۔ وقت بالکل نہیں تھا۔ لہذا میں نے اسی رانفل سے چیتے پر فائر کیا لیکن ناکام رہا۔ چیتا اٹلے پاؤں پھر اور تیزی سے بھاگتا ہوا ہمارے کیمپ کی پشت پر واقع ایک نالے کی طرف چلا گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے دوڑا لیکن وہ نالہ پار کر کے اس کے دوسرے کنارے پر پہنچ چکا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ دیوبان کا چکر لگا کر آیا تھا لیکن جب وہاں اسے کچھ نہ ملا تو قسمت آزمائی کے لیے ہماری طرف آنے کا ارادہ کیا۔

میرا خیال تھا کہ یہ آدم خور چیتا ابھی ہمارے علاقے میں ہے۔ اس لیے میں نے اگلی شام کو اپنے کیمپ سے کچھ فاصلے پر ایک چھان بندھوائی اور اس کے بالکل قریب ایک درخت کے نیچے ایک بکری بھی بندھوا دی۔ آدمی رات کے قریب جب میں چھان پر کچھ غنودگی کے عالم میں بیٹھا تھا۔ میں نے بکری کی اچھل کود کی آوازیں سنی، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی جانور اس پر حملہ آور ہو چکا ہے۔ میں نے اسی وقت نشانہ لیا اور گولی چلا

دی۔ گولی کا چلانا تھا کہ یک دم خاموشی چھا گئی۔ میں نے سیٹی بجائی اور تھوڑی دیر میں میرے آدمی لائین لے آئے۔ حملہ کرنے والا درندہ ایک گلوگر تھا جس نے ہماری کبری کے زرخے کو اپنے دانتوں میں جکڑتی سے دبایا ہوا تھا اور اسی عالم میں اپنی جان بھی کھو بیٹھا تھا۔

اس واقعے کے دو روز بعد میں شام گھوڑے پر سوار چلا آتا تھا کہ میرے ساتھی کول نے مجھے ایک چیتا دکھایا جو ہم سے کوئی دو سو گز پر ایک پہاڑی چٹان پر بیٹھا ہوا تھا، میں نشانہ لے رہا تھا کہ چیتا اٹھ کھڑا ہوا۔ شاید اس کا ارادہ ادھر ادھر چھلانگ لگانے کا تھا لیکن میری رائفل چل چکی تھی۔ گولی اس کے سینے میں لگی اور وہ پلٹ کر پیچھے کی طرف گر پڑا۔ ہمارا خیال تھا کہ آج ہم نے آدم خور کو زیر کر لیا ہے لیکن جب ہم پہاڑی پر پہنچے تو معلوم ہوا، یہ تو اوسط قد کی مادہ ہے جس کے متعلق پورے کیمپ کی رائے تھی کہ یہ ہرگز آدم خور نہیں ہے کیونکہ آدم خور جسمانی لحاظ سے بڑے قد و قامت کا بتایا گیا تھا۔ ابھی ہم اس معاملے پر غور ہی کر رہے تھے کہ اگلے روز ہمیں یہ اطلاع موصول ہوئی کہ موضع اجمارا کا ایک لڑکا گم ہو گیا ہے۔ یہ لڑکا اپنے چھ سات ہم عمر لڑکوں کے ہمراہ جنگل میں سوکھی لکڑیاں چننے کے لیے گیا ہوا تھا کہ وہیں گم ہو گیا۔ ہر چند اس کو تلاش کیا گیا مگر اس کا کوئی نشان نہ ملا۔ ہاں ایک جگہ کچھ خون ضرور پڑا ہوا ملا۔

لڑکے کے گم ہو جانے کی خبر مجھے اسی روز بعد از دو پہر مل گئی اور میں اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر موضع اجمارا روانہ ہو گیا۔ اجمارا سے میں نے تین آدمی ہمراہ لیے جو مجھے اس جنگل میں لے گئے جہاں سے لڑکا گم ہوا تھا۔ ہم اس مقام پر بھی گئے جہاں لڑکے کا خون پڑا ہوا تھا لیکن جا بجا کانٹے دار جھاڑیوں کی وجہ سے یہ یقین کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ درندہ لڑکے کی لاش کو کدھر لے گیا ہے۔ ہم پریشان ہو کر لوٹ رہے تھے کہ میں نے قریبی پہاڑی کے اوپر گدھوں کو چکر لگاتے دیکھا، ان کی موجودگی سے میرا یہ شبہ قوی ہو گیا کہ ہونہ ہولڑکے کی لاش یہیں کہیں پہاڑی پر موجود ہے۔ چنانچہ ہم لوگ پہاڑی کی طرف روانہ ہو گئے، میں سب سے آگے آگے پہاڑی پر چڑھ رہا تھا کہ مجھے کچھ پتھروں کے گرنے کی آواز آئی جو غبی میں نے اس طرف دیکھا، ایک چیتا بجلی کی طرح ایک چٹان سے کودا اور جھاڑیوں میں گم ہو گیا۔ ہمیں چیتے کو دیکھ کر یہ یقین تو ہو گیا کہ اب ہم لڑکے کی لاش کے قریب آن پہنچے ہیں۔ لیکن آدمیوں کی نفی انتہائی کم ہونے کی وجہ سے ہم اس وقت چیتے سے دو دو ہاتھ نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ ہم نے لڑکے کی لاش کی تلاش جاری رکھی اور جلد ہی اسے پالیا۔ لڑکے کی لاش دو بڑی چٹانوں کے درمیان پڑی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ صحیح و سالم تھا لیکن سینے میں ایک بڑا سوراخ تھا۔ اس کے علاوہ اس کے ہاتھوں اور ٹانگوں کا گوشت بھی درندے نے کھا لیا تھا۔ بہر حال یہ منظر بے حد وحشت انگیز تھا لیکن ہمیں دیکھنا پڑا۔

میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ لڑکے کی لاش کو اٹھالیں اور گاؤں چلیں کیونکہ اب سورج بھی غروب ہوا چاہتا تھا۔ تمام راستے میں یہی سوچتا رہا کہ اس درندے کو کیسے قابو کیا جائے کیونکہ وہ روز بروز دلیر ہوتا جا رہا تھا اور مرنے والوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ مجھے اجمارا کے لوگوں نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اگر یہ صورت حال یوں ہی قائم رہی تو پھر وہ سب کے سب اس گاؤں کو چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں گئے۔ ظاہر ہے کہ ایسے اقدام سے حکومت کی بدنامی ہوتی تھی۔ میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ مجھے چند دن کی مہلت اور دیں۔

اگلی صبح ایک سب انسپکٹر پولیس جو ہندو تھا، ہمارے کیمپ میں آیا چونکہ پچھلے دنوں موضع اجمارا میں چیتے کے ہاتھوں کئی آدمی مارے جا چکے تھے، اس لیے وہ پولیس رپورٹ تیار کرنے کے لیے وہیں جا رہا تھا۔ مجھے اس سرکاری ملازم کی باتیں سن کر حیرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آیا۔ اس نے بتایا

کہ یہ چیتا دراصل کوئی بدروح ہے جو چیتے کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ اس لیے مجھے چاہیے کہ میں اس کا بالکل پہچان نہ کروں بلکہ واپس چلا جاؤں ہو سکتا ہے کہ کل کلاں کو مجھے اس سے نقصان پہنچے یا میرا کوئی آدمی اس کے ہاتھوں مارا جائے۔ تھانے دار کی یہودہ باتوں کا مجھ پر تو کیا اثر ہونا تھا۔ بہر حال وہ چلا گیا۔ میرا کیمپ وہیں لگا رہا اور اگلا ہفتہ پورے کا پورا بغیر کسی حادثے کے خیریت سے گزر گیا۔ میں حیران تھا کہ چیتا کہاں گیا۔ ایک شام کو میں معمول کے مطابق میری کوئٹھیں نکلا بلکہ کیمپ کے باہر ایک کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھا کہ میرا سائیکس ہانپتا کا پتا بھاگا ہوا میرے پاس آیا۔ اس نے بتایا کہ اس نے ایک چیتے کو ہمارے کیمپ سے کوئی سو گز دور آسموں کے درختوں کے چھنڈے سے گزر کر نالے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا ہے، میں نے اس سے زیادہ کچھ اور نہیں سنا، فوراً اٹھا اور اپنے خیمے سے اعشاریہ تین سو میٹر میں پھر رائفل سنبھالی اور اس طرف دوڑ پڑا۔ جس طرف کی نشاندہی سائیکس نے کی تھی۔ نالے کے کنارے پہنچ کر مجھے ایک مرتبہ تو کچھ نظر نہ آیا لیکن دوسرے لمحے میں نے دیکھا کہ نالے کے دوسرے کنارے کے پس پشت پہاڑی ڈھلان پر ایک چیتا آہستہ آہستہ قدم قدم رکھتا ہوا اوپر چڑھ رہا ہے۔ اگرچہ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا، تاہم اس کے باوجود اس نے اپنی چال میں کوئی پھرتی یا حیرتی نہیں دکھائی۔ خوش قسمتی سے اس کے آس پاس کوئی جھاڑی بھی نہیں تھی جہاں وہ پناہ لے سکتا۔ حالات بڑے سازگار نظر آ رہے تھے اور میں محسوس کر رہا تھا کہ آج چیتا مجھ سے بچ کر نہیں جاسکتا۔ میں نے بڑے اطمینان سے نشانہ لیا اور ٹریگر دبا دیا۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ میرے فائر نے درندے کو گرادیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ایک فائر اور کیا جس نے وہی کسی کسر بھی پوری کر دی اور چیتا اب زمین پر بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔

میرے فائر کی آواز سنتے ہی گاؤں کے لوگ بھی دوڑتے ہوئے وہاں آ گئے۔ چیتے کو جا کر دیکھا تو سب کی یہ منتظرہ رائے ہوئی کہ وہی آدم خور چیتا ہے جو اس علاقے کے لوگوں کے لیے بلائے جاں بنا ہوا تھا۔ بس اب کیا تھا، دیہاتیوں نے جوش مسرت سے میری ”بے“ کے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ فوراً ہی ایک تندرست و توانا کول میرے نزدیک آیا اور ہم لوگ ایک جگہ کی شکل میں اپنے کیمپ پہنچے۔ یہ خبر جلد ہی قریبی دیہات میں پہنچ گئی اور چیتے کو دیکھنے دکھانے کا سلسلہ اگلے روز تک جاری رہا۔ اس کے بعد میں نے اس کی کھال اتروالی۔ یہ رات میں نے دیوبان میں گزاری اور اگلی صبح وہاں سے روانہ ہو گیا۔

روانہ ہونے سے چند گز میں نے گاؤں کے سردار کو اپنے کیمپ میں بلایا اور اسے نصف درجن پوسٹ کارڈ جن پر میں نے اپنے قلم سے اپنا پتہ لکھا ہوا تھا، دیئے اور اسے ہدایت کی کہ وہ ہر پختے مجھے ایک پوسٹ کارڈ ارسال کرتا رہے کہ میں نے واقعی صحیح آدم خور کو مارا ہے اور اب ان کے علاقے میں کوئی آدم خور دیکھنے میں نہیں آ رہا ہے۔ سردار نے چھ ہفتوں تک میری ہدایت کی تعمیل کی اور مجھے یہ کہتے ہوئے بے حد خوش محسوس ہو رہی ہے کہ میں نے صحیح آدم خور کو مارا تھا۔ مجھے یہاں ایک افسوس بھی ہے اور وہ یہ کہ میری اس ہندو تھانے دار سے ملاقات نہ ہو سکی جس نے اس آدم خور کو بدروح قرار دیا تھا۔ ملاقات ہوتی تو میں اسے بتاتا کہ میں نے اس بدروح کو مار ڈالا ہے۔



انگولا کا شیطان

جہاز کے بالائی عرشہ پر ایک آرام کرسی پڑی رہتی تھی اور ایک عمر رسیدہ اور دراز قامت انگریز روزانہ صبح 9 بجے اس پر آکر لیٹ جاتا اور دوپہر کے کھانے تک ساکت و صامت آنکھیں بند کیے پڑا رہتا۔ کسی مسافر کو علم نہ تھا کہ وہ کون ہے، نہ کوئی اس کی طرف دوتی کا ہاتھ بڑھاتا، نہ وہ خود کسی سے مخاطب ہوتا تھا۔ لیکن کپتان سے لے کر جہاز کے خلاصی تک اس کی انتہائی تعظیم کرتے اور اس فکر میں رہتے تھے کہ اس کی خدمت کا کوئی ادنیٰ ساموق مل جائے۔

انسان فطرتاً راز جو ہے، میرے دل میں بھی گم گدردی ہونے لگی کہ اس کا نام اور مقام معلوم کیا جائے، چنانچہ ایک دیرینہ ملازم سے اس کا تذکرہ چھیڑا ہی تھا کہ اس نے مجھے اس طرح گھور کر دیکھا جیسے میں کوئی بخود الموحس ہوں اور مجھے خدا اپنے حال احوال کی خبر نہیں۔ کہنے لگا: ”آپ کس دنیا کے باشندے ہیں کہ ہاتھوں کے شہرہ آفاق شکاری کا رپو سے ناواقف ہیں۔ ان کی عمر سو سے تجاوز کر چکی ہے لیکن یہ ابھی افریقہ سے دنیا کے خطرناک ترین ہاتھی کو ہلاک کر کے وطن واپس جا رہے ہیں۔“

کارپو..... کارپو یہ نام میرے ذہن میں چٹکیاں لینے لگا۔ کان اس سے آشنا تھے۔ تحت الشعور میں اس کے متعلق کچھ عجیب سی داستان بھی موجود تھی، لیکن یادداشت کام نہیں کر رہی تھی۔ اس سوچ میں کھڑا تھا کہ بوڑھے نے آنکھیں کھولیں اور مجھے بالکل نزدیک دیکھ کر بول اٹھا: ”تمہاری کیا خواہش ہے؟“ اور نہ معلوم کیوں بلا ارادہ میرے منہ سے نکل گیا: ”آپ سے انٹرویو لینا چاہتا ہوں“ حالانکہ اب جو میں غور کرتا ہوں تو اس ماحول میں یہ جملہ بالکل ہی معشکہ خیز نظر آتا ہے۔ میں کوئی اخبار نویس ہوں نہ کسی رسالہ کا ایڈیٹر، نہ مجھے یہ معلوم ہے کہ انٹرویو کس طرح لیا جاتا ہے اور ایک شکاری سے کس قسم کے سوال کرنے چاہئیں۔ لیکن تیر بلا نشانہ لیے ہی کمان سے نکل چکا تھا۔ اب یہ اتفاق ہی ہے کہ ایک شاعر کی طرح جو اپنے اشعار سنانے کے لیے ہمیشہ مضطرب اور بے چین رہتا ہے۔ کارپو کو بھی اپنے کارناموں کی داستان بیان کرنے میں غیر معمولی لذت حاصل ہوتی تھی۔ میرا جواب سن کر اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں لیکن اس کے ہونٹ کھل گئے تھے۔ ان میں کچھ ارتعاش بھی تھا اور شاید زیر لب کچھ کہتا بھی جا رہا تھا۔ دراصل وہ اپنے خیالات کو مجتمع کر رہا تھا اور اس خیال میں تھا کہ کیا جواب دے۔ پندرہ منٹ اسی شش و پنج میں گزر گئے اور میں واپسی کے لیے مڑنا ہی چاہتا تھا کہ اس نے آنکھیں کھولیں، میری طرف سے غور سے دیکھا اور پوچھا آپ کو ہاتھوں سے کیا دلچسپی ہے۔ میرے پاس سوائے جج کہنے کے کوئی جواب نہ تھا کہ میں جانوروں کے متعلق ایک کتاب لکھ رہا ہوں اور اس میں ہاتھوں کا بھی ایک باب ہے، آپ کی مہیا کردہ اطلاعات سے اس میں بے پناہ اضافہ ہو سکتا ہے۔ یہ سن کر اس کے خشک لبوں پر قدرے مسکراہٹ نمودار ہوئی اور یہ کہا کہ اچھا تو شام کی چائے پر ملاقات ہوگی۔

دماغ کارپو کی شخصیت متعین کرنے کی جستجو میں برابر لگا رہا۔ اس کے متعلق کہاں اور کیا سناتا تھا۔ کس کتاب یا رسالے میں اس کی تفصیل لکھی

تھی۔ ذہن ان سوالات کا جواب دینے سے قاصر نظر آتا تھا۔ انگریز کی مشکل ہے کہ اطمینان سے سو جاؤ۔ مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا، چنانچہ میرے ساتھ بھی یہ ہوا۔ خواب کے دوران ماضی کے اوراق اُلٹنے شروع ہو گئے۔ اور تاریخ کے پردوں پر 21-1920 کے وہ نظارے رونما ہونے لگے جب ہندوستان کا سکون آنجہانی گاندھی کی تحریک عدم تعاون سے پارہ پارہ ہو رہا تھا۔ اسی زمانے میں اخبارات نے برما میں جنگلی ہاتھیوں کی چیرہ دستیوں کے واقعات پر بھی تبصرہ شروع کر دیا۔ ان درندوں نے چادلوں کے کھیت تباہ کرنے اور انسان کشی کی مہم شروع کر رکھی تھی اور لطف یہ ہے کہ اگر کوئی سدھایا ہوا ہاتھی ان کو اس فعل قبیح سے باز رکھنے کی کوشش کرتا تو وہ اس کے بھی دشمن بن جاتے تھے۔ اس وقت بھی کارپو تھا جس کو ان خطرناک موذی جانوروں کی بیخ کنی کے واسطے مامور کیا گیا تھا۔ اور جس طرح گزشتہ جنگ عظیم میں بن غازی یا بطروق کی فتوحات پر خوشیاں منائی جاتی تھیں۔ اسی طرح برما میں ہر خونی ہاتھی کی ہلاکت پر شادیانے بجاے جاتے اور چراغاں کیا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ اس شکاری نے پوری سرزمین کو ان مہیب عفریتوں سے پاک کر کے ہیر و کا درجہ حاصل کر لیا۔ ان واقعات کو سا لہا سال گزر چکے تھے۔ اور یادیں دماغوں میں دفن ہو چکی تھیں اور اس وقت کارپو مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے سکندر یا ہانی بال کا مردہ قبر سے نکل کر اپنی داستان حساب سنانے آجائے اور جنگلی ہاتھیوں کا ذکر چھیڑ دے۔

مجھے جانوروں سے فطری طور پر دلچسپی بھی ہے اور ان کے متعلق ایک مضبوط کتاب لکھنے کا عزم بھی جس کے لیے دور دراز سفر کر کے مواد بھی جمع کر رہا ہوں۔ اس لیے روئے زمین کے اس عظیم الجثہ حیوان کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا جو زریں موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ اس پر ایک طرف تو دل خوشی سے ملیوں اچھل رہا تھا لیکن دوسری طرف فکر بھی سوہان روح بنی ہوئی تھی کہ میری طرف سے کیا سوالات ہوں گے اور اگر وہ کارپو جیسے ماہر فن کی نظروں میں نہ بچے اور محض سطحی ثابت ہوئے تو وہ میرے متعلق کیا رائے قائم کرے گا اور ان کا جواب دینا پسند بھی کرے گا یا نہیں۔ گھڑی کی سوئیاں تیزی سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ میں نے کاغذ پھسل لے کر چند ایک باتیں نوٹ کیں لیکن پھر خود ہی انہیں مہمل گردان کر قلم زد کر دیا اور جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اس کے پزے پزے کر کے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ ادھر مطبخ کے داروغہ نے آکر اطلاع دی کہ کارپو صاحب آپ کو یاد کر رہے ہیں اور کئی مرتبہ آپ کے متعلق دریافت کر چکے ہیں۔

ہرچہ بادا باد کہہ اٹھا اور اس کے کمرہ میں پہنچ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انٹرویو کے لیے میں نہیں بلکہ وہ تیار ہو رہا تھا، بے شکن استری کیا ہوا سرموٹ زیب تن تھا۔ جیب میں ہاتھی دانت کا بنا ہوا ایک پن لگا ہوا تھا جس پر سرخ یا قوت جگمگ کر رہا تھا۔ نشست بھی بجائے آرام کرسی کے گدے دار صوفہ پر تھی، میز پر علاوہ سادہ چائے کے کچھ مٹھائیاں، کچھ بسکٹ، کچھ دیسی پکوان دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی داستان حیات اور ہاتھیوں سے محاذ آرائی کے افسانے سنانے پر پوری طرح کمر بستہ ہے۔ مجھ سے تو اس نے بس ایک یہ سوال کیا کہ آیا آپ کا تعلق اسی پاکستان سے ہے جس میں چٹا گام کے پہاڑی جنگلات دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں اور جہاں پہلی جنگ عظیم کے بعد کئی مست ہاتھیوں کا شکار کیا تھا۔ ان میں سے تو ایک نے اپنی دانست میں گڑھا کھود کر مجھے زندہ دفن ہی کر دیا لیکن اگلے روز جب وہ میری قبر پر فاتحہ پڑھنے آیا تو یہ دیکھ کر حیرت میں رہ گیا ہوگا کہ قبر اکھڑی پڑی ہے اور مردہ غائب ہے۔ اس پر اس نے خود ہی ایک زوردار قہقہہ لگایا جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اس بیچارہ سال میں بھی اس کی زندہ دلی کتنی جوان ہے۔

میرے منہ سے نکل گیا کہ میں آپ کی داستانِ حیات سننے کا بے حد متحنی ہوں۔ وہ بھی گویا ادھار کھائے بیٹھا تھا، کہنے لگا۔ پہلی بات تو یہ سمجھ لیجئے کہ ہاتھی کا شکار کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ اس کے لیے شیر کا دل پہلو میں ہونا لازمی ہے۔ اس پہاڑ جیسے جانور کے سامنے انسان کی ہستی پر کاہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ ذرا چوکے اور عدمِ آبادی کے بارے میں نے اگر بالکل بچپن ہی میں ان سے گئے کھانے نہ دیکھے ہوتے تو اس وقت تک میری ہڈیاں بھی گل سڑ گئیں ہوتیں۔

ہوایوں کہ میرے والد صاحب کو جب تجارت میں خسارہ ہوا تو لوگوں نے شہ دی کہ افریقہ جا کر ہاتھیوں کا شکار کریں اور ان کے دانت فروخت کر کے لکھ پتی بن جائیں۔ میری عمر اس وقت چودہ سال کی تھی، والدہ انتقال کر چکی تھیں۔ کوئی رشتہ دار ایسا نہ تھا جو مجھے اپنے ہاں رکھ لیتا، اس لیے مجھے بھی ہمارا لینا پڑا۔ ہم لوگ افریقہ کے ایک گھنے جنگل میں پہنچے اور ایک جھونپڑی میں رہنے لگے۔

ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ والد صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اب اس دنیا میں میرا کوئی سہارا نہ رہا۔ نیچے زمین اور پر آسمان مگر جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے۔ اگلے دن ہی ایک دلندہ یزی تاجر سے ملاقات ہو گئی جو پری ٹوریا سے گوا جایا کرتا تھا۔ میں اس سے منسلک ہو گیا۔ اس کے کچھ ساتھی اور ملازم شکاری بھی تھے۔ میں نے بھی بندوق سنہال لی اور ہاتھی دانت اکٹھے کرنے شروع کر دیے۔ آپ لوگوں کو کچھ بھی اندازہ نہیں کہ اس تجارت میں کتنا نفع ہے۔ میں نے چند روز میں اپنی حالت سنہال لی اور مسٹر کھلانے لگا۔ اس زمانے کے افریقہ کا حال نہ پوچھئے، پناہ بخدا، ہم انگریز اپنے آپ کو خدائی ایجنٹ سے کسی طرح کم نہ سمجھتے تھے، لیکن یہاں آکر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس براعظم میں تو شیطان کی حکومت ہے، کالے کلوٹے، مونے مونے موٹے ہونٹوں والے وحشی جمشی سردار مختلف علاقوں کے مالک تھے اور ان کی مرضی کے بغیر ہاتھی تو درکنار ایک چڑا مارا بھی جان سے ہاتھ دھونے کے مترادف تھا۔ میں نے ان آنکھوں سے وہ نقشہ دیکھا ہے کہ یورپ کے سفید فام باشندے ان فرعونوں کے سامنے پیٹ کے بل چلنے پر مجبور تھے جس کے بعد طرح طرح کی خوشامد و تعلق سے انہیں ہاتھی کا شکار کرنے یا سونے کی کان کھودنے کی اجازت ملتی تھی۔ میں اس ذلت سے تو بفضلِ خدا محفوظ رہا اور حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھلایا کہ مجھے اس ذلت سے کبھی دو چار نہ ہونا پڑا۔ ہوایوں کہ جس بستی میں ہمارا قیام تھا، اس سے بالکل ملحق ہی وہ جنگلات تھے جو ہر قسم کے جنگلی جانوروں، شیر، چیتے، گلداز وغیرہ کے مسکن بنے ہوئے تھے۔ ان کی جب غذا کی تنگی ہوتی تو آبادی کا زرخ کرتے اور ہر طرف تہلکہ مچ جاتا۔ میرا نشانہ اس وقت تک سو فیصدی درست ہو چکا تھا۔ اس لئے میں نے جب دوراتوں میں تین سو بیویوں کو فنا کے گھاٹ اتار دیا تو انہوں نے اس طرف کا زرخ کرنا چھوڑ دیا۔ اس کے صلہ میں مجھے سردار قوم کی طرف سے اعزازی جام اور پھولوں کا تاج عطا ہوا جو آج بھی میرے عجائب خانہ کی زینت ہے۔ کون تھا جو مجھے شکار سے منع کرتا لیکن یہ نہ سمجھئے کہ اس سے میرا کام آسان ہو گیا۔ آپ کے ذہن میں آئی نہیں سکتا کہ ان گھنے جنگلات میں اس جیسے تن و توش کے جانور کا پتہ لگانا آسان نہیں ہوتا، حالانکہ ان کا ریوڑ بعض اوقات سوسو اسو جانوروں پر مشتمل ہوتا ہے۔

☆☆☆

ایک روز ان عفریتوں کی جستجو میں نکلا تھا کہ دو خاتونوں کو بندوق لیے اس طرف آتے دیکھا، ان میں ایک نوجوان اور دوسری ادھیڑ عمر تھی۔ لڑکی کا نام اسٹہر تھا۔ جسم جسم اور آزاد جوانی کا زندہ مجسمہ، سنہری بال اور لبوں پر مستقل مسکراہٹ ہاتھ میں بندوق ہم جوتی کا پتہ دے رہی تھی۔ کون

کافر ہوگا جو دل نہ دے بیٹھے۔ میں پہلی ہی نظر میں اس شیخ کا پروانہ بن گیا۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ ایک مشنری پاروی کا خاندان ہے جو انگلستان سے ان وحشیوں اور کافروں کو حضرت مسیحؑ سے روشناس کرانے آیا ہوا ہے۔ باپ تو اپنے مذہبی کاموں میں مصروف رہتا ہے اور بیٹی کو شکار کا شوق بجائے آبادی کے کشاں کشاں جنگل کی طرف لے جاتا ہے۔

ابتدائی گفتگو کے بعد طے ہو گیا کہ اگلے روز سے ساتھ ہی شکار کو چلا کریں گے، ماں بھی خوش ہوئی کہ اسے خواہ خواہ جھانپوں میں گھس کر بدن کو ابولہبان کرانے سے نجات مل گئی۔ اسٹہر کی نظر کسی دور بین سے کم نہ تھی۔ زیر درختی جنگلات میں ہاتھی بڑی آسانی سے چھپ جاتے ہیں لیکن وہ انہیں ڈھونڈ نکالتی تھی اور میں کبھی ایک کبھی دو کا روزانہ شکار کر لیتا تھا، پھر شام تک ہم ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر پیار اور محبت کی باتیں کیا کرتے تھے۔ ہاتھی دانت کی فروخت سے چند ہی روز میں میری مالی حالت اتنی مستحکم ہو گئی کہ میں نے پاروی صاحب کو ان کی لڑکی کے لیے پیام دے دیا جو بلا پس و پیش منظور ہو گیا اور ہماری شادی اسی جنگل میں ہو گئی جہاں نہ رہنے کے واسطے گھر تھا، نہ سونے کے لیے مسہری۔ آخر یہ طے پایا کہ ایک ایسی موٹر خرید لی جائے جو سواری کا بھی کام دے سکے اور گھرداری کا بھی اور اسی کے ذریعے شہر سے سامان لا کر ایک مکان کی بنیاد ڈالی جائے جس میں ہمارے دن بگل سدا بہار پر فضا ہوا میں آزادانہ زندگی بسر کر سکیں۔ ایک سال کے بعد اس درخت کے سامنے جو آج بھی ہمارے عاشقانہ دورِ حیات کی یادگار کے طور پر موجود ہے۔ ایک چھوٹا سا خوب صورت بنگلہ تعمیر کر لیا اور ہم دونوں کی متفقہ کوششوں اور کوششوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ بہت جلد مجھ کو ہاتھیوں کے شکار اور دانتوں کی تجارت میں بین الاقوامی شہرت حاصل ہو گئی۔ افریقہ سے بیرونی دنیا میں ہماری ایجنسیاں کام کرنے لگیں لیکن افسوس۔

شکاری نے ایک گہری سانس لی، جس کے ساتھ ہی ایک آہی منہ سے نکلی اور چند منٹ کے واسطے بالکل خاموش ہو گیا، منہ رومال سے ڈھک لیا۔ ممکن ہے کہ امنڈنے والے آنسوؤں کو مجھ سے چھپانے کی کوشش کر رہا ہو، لیکن جلدی ہی اپنے جذبات پر قابو پانے میں کامیاب ہو گیا اور داستان کا تانا بانا جس جگہ سے ٹوٹا تھا، اسے مربوط کر کے پھر کہنا شروع کیا۔

افسوس! ہمارے یہ خواب کبھی شرمندہ تعمیر نہ ہوئے، ہر طرح کے جتن کیے۔ حتیٰ کہ مقامی ملا سے جھانپو چھ اور جھنڈا اکثر سے جادو ٹوٹے کرانے میں بھی دریغ نہ کیا لیکن بچے کے نام پر چوہیا تک پیدا نہ ہوئی۔ ہم دونوں کی محبت اب ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی کے اظہار میں صرف ہونے لگی۔ دونوں کو ایک ہی غم کھائے جا رہا تھا اور دونوں منافقانہ طور پر ایک دوسرے کو ڈھارس دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ آخر یہ طلسم بھی چند روز میں ٹوٹ گیا۔ اسٹہر نے شکار میں دلچسپی لینی چھوڑ دی اور اب مجھے تنہا ہی اور وہ بھی بادل ناخواستہ ہاتھیوں کی تلاش میں نکلنا پڑتا تھا۔ اس وقت تک جانور بھی چونکا ہو گئے تھے اور دور ہی دور رہتے تھے۔ نتیجہ یہ کہ کاروبار میں بھی خلل واقع ہونے لگا۔ دوسری طرف بیوی کو اولاد کا غم اندر ہی اندر کھانے لگا۔ اس کی صحت جو کسی زمانہ میں قابلِ رشک تھی، رفتہ رفتہ گرنے لگی۔ اور چند روز میں تو یہ حالت ہو گئی کہ اٹھ کر پانی پینا بھی مشکل ہو گیا۔ میں نے بے انتہا اصرار کیا کہ شہر میں چل کر علاج کرائے مگر وہ یہ کہنے لگی کہ میں تو مرنا چاہتی ہوں اور میری آخری تمنا یہ ہے کہ اسی بیڑ کے نیچے دفن ہوں جس کے تلے ہماری محبت پر دان چڑھی تھی۔ ہماری شادی کو بیس سال ہو چکے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کل کی بات ہو۔

☆☆☆

وہ تو چند روز میں رخصت ہوگئی لیکن میری دنیا تاریک کر گئی۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں اور کہاں جاؤں آخر خلعت برکار شیطانی کہہ کر کاروبار کو سمیٹا اور جو کچھ جمع تھا تھا، لے کر انگلستان کا رخ کیا۔ چند روز گلیوں اور سڑکوں پر جوتیاں چٹخا تا رہا۔ لوگ میرے نام اور کارناموں سے بخوبی واقف تھے۔ کوئی مجھ سے ہمدردی کرنے اور کوئی میرے کارنامے سننے آجایا کرتا تھا۔ وقت اسی طرح گزرتا رہا، حتیٰ کہ برما میں جنگلی ہاتھیوں نے ایسے ہنگامہ مچایا کہ ہماری حکومت نے گاندھی کے شور و شر کو بھی پس پشت ڈال کر پہلے اس کے سد باب کی فکر کی اور محکمہ خارجہ نے بغیر مجھ سے پوچھے خود ہی طے کر لیا کہ اس اکھاڑے میں میرے بغیر کوئی پہلوان کامیاب نہیں ہو سکتا۔ حکومت کی طرف سے درخواست ہوئی کہ اس مہم پر چلا جاؤں اور انکار نہ کروں۔

ضروری سامان سفر تیار کیا اور ایک بار بردار جہاز سے روانہ ہو کر رنگون کی بندرگاہ پر جا اترا۔ برما کے متعلق کیا عرض کروں۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ قدرت نے اس علاقہ کو ہاتھیوں ہی کے واسطے بنایا ہے۔ درمیان سے ایک بڑا دریا گزرتا ہے جس کے دونوں جانب گھنے جنگلات ہیں۔ بانسوں کی کثرت ہے جو اس دیو پیکر جانور کی مرغوب غذا ہے۔

ہاتھیوں کے غول اس طرح دندناتے پھرتے ہیں کہ شریک ان سے خائف رہتے ہیں۔ جب یہ کسی طرف کا رخ کرتے ہیں تو ایک آزمودہ کار تھنی سب سے آگے سوٹا اور اٹھائے ہوا میں دشمن کی بوسٹھتی ہوئی بڑھتی ہے۔ اس کے پیچھے کچھ خوند تو اتنا نہ ہوتے ہیں۔ درمیان میں باقی ماندہ ہاتھی، ہتھنیاں اور عقب میں وہ حفاظتی دستہ ہوتا ہے جو خطرہ درپیش ہونے کی صورت میں پورے لگ لگا کا حاطہ کر کے ان کی حفاظت کرتا ہے۔ ایٹائی ہاتھی اپنے افریقی بھائیوں سے جسامت میں کچھ چھوٹے ہوتے ہیں لیکن ایک بات ضرور کہوں گا کہ بندر کے بعد اگر کوئی ہوشیار جانور کرہ زمین پر موجود ہے تو وہ یقیناً ہاتھی ہے۔ اس کا دماغ عجیب طرح سے کام کرتا ہے اور مسائل تو اس طرح حل کرتا ہے کہ انسانی عقل حیران رہ جاتی ہے۔ کسی زمانہ میں ریل مسکون پر اسی کا راج تھا اور انسان اس کے سامنے چوٹی سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا تھا کہ جب چاہے پاؤں سے کچل دے۔ دوست بنا کر تو اس سے جتنا چاہیے کام لے لیجئے۔ لیکن اس کی معمولی دشمنی بھی موت کو دھوٹ دینے کے مترادف ہے۔ برما ہی کا ایک واقعہ ہے کہ مہاوہ ہاتھی کو پانچ سیر کی موٹی موٹی روٹیاں کھلایا کرتا تھا۔ ایک روز اس نے دیکھا کہ فیلبان نے کچھ آٹا بچا لیا، اور گھر لے گیا۔ اس پر ہاتھی کو اتنا تاؤ آیا کہ وہاں آتے ہی اسے سوٹ سے پکڑ کر دو کھڑے کر دیا اور لاش کو تھیت کر دریا میں پھینک آیا۔

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ برما ہاتھیوں کا ملک ہے، اپنی گلی میں کتا بھی شیر ہوتا ہے اور یہ تو کہہ ارض کے سب سے بڑے جانور تھے، جو کچھ کرتے کم تھے۔ سرزمین ان کی اپنی تھی۔ انسان تو اس پر ناجائز طریقوں سے قابض ہو گیا تھا اور طرح طرح کی فصلیں اگا رہا تھا۔ ان میں گنا اس کی مرغوب غذا تھی۔ اس لیے سب نے مل کر من حیث القوم طے کر لیا کہ اس فصل پر ان کی اجارہ داری ہوگی اور وہ کسی کو اپنے پاس پھٹکنے کی اجازت نہ دیں گے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ ایک مستقل جنگ کی صورت میں روٹنا ہوا۔ جس میں انسان کی بری طرح شکست اور ہسپانی ہوئی سینکڑوں جانیں ضائع ہو گئیں اور گھروں کی جو بربادی ہوئی اس کا تو شمار و قہار ہی نہیں۔ کیونکہ یہ کھیت کے مالکوں کا تعاقب کرتے اور ان کی جھوٹیاں اُجاڑ کر واپس لوٹنے تھے۔ شہر کے تمام کارخانے بند ہو گئے۔ عام لوگ الگ پریشان تھے کہ اس مصیبت سے کس طرح بچنا جائے۔

آخر ان کے خلاف جنگ کا ایک زبردست منصوبہ تیار کیا گیا۔ شکاریوں کی ایک کھیپ بھرتی ہوئی۔ ہر طرح کی بندوقیں اور سامان حرب مہیا کیا گیا۔ دو تین جانور ہلاک بھی ہوئے لیکن جیسا میں عرض کر چکا ہوں۔ ہاتھی صرف جسمانی طاقت ہی میں مالک علی الاطلاق نہیں۔ سوجھ بوجھ میں بھی کسی سے کم نہیں۔ اس نے بھی ایک دفاعی بلکہ جارحانہ منصوبہ بنالیا اور رات شکاریوں کے کیپ پر ایسا شخون مارا کہ تہلکہ مچ گیا۔ بہت سے تو موقع پر ہلاک ہو گئے اور جو اکا دکا بچ رہے، ان کو فراری میں عافیت نظر آئی۔ اخباروں نے شور مچانا شروع کیا۔ ایک نے سرخی لگائی طے کرنے کا مسئلہ۔ برما میں انگریز کی حکومت ہے یا ہاتھی کی۔ دوسرے نے لکھا، میں ڈٹے رہنا چاہیے یا ملک ہاتھیوں کے حوالے کر کے واپس آ جانا چاہیے۔

یہ حالات تھے جن میں مجھے برما جانے کو کہا گیا جس کی وجہ سے جان عزیز ہوئی، مہم شروع ہوئی۔ ابتداء میں مجھے بھی پے در پے نا کامیوں کا منہ دیکھنا پڑا۔ پھر مجھ میں یکا یک شکاری کی روح بیدار ہوگئی اور ایک دن میں پانچ ہاتھیوں کی ہلاکت عمل میں آئی، اخبار میں تصاویر شائع ہوئیں۔ ٹائمز آف انڈیا نے کثیر معاوضہ دے کر میرے کارناموں کو شائع کرنے کا ٹھیکہ لیا۔ ہاتھی دانت سے جو رقم حاصل ہوئی، وہ بھی لاکھوں تک پہنچتی تھی۔ ایک سال سے زیادہ عرصہ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ جس کی پوری تفصیل اخبارات میں موجود ہے۔

☆☆☆

بوڑھا شکاری اب تک اپنی داستان حیات بیان کرتے کرتے کچھ تھکان محسوس کرنے لگا تو میں نے ہیرے کو مشروب لانے کا اشارہ کیا۔ دونوں نے ایک ایک پیالی قبوہ پیا۔ میں نے ایک اناڑی کی طرح سوال کر دیا کہ آپ اپنے شکار کا کوئی خاص واقعہ بیان فرمائیے۔ اس دوران کار کا تخیل خدا معلوم کن پیچیدہ راہوں میں گشت کرتا ہوا پھر اسی جگہ پہنچ گیا تھا جہاں اس کی شریک حیات ابدی نیند سو رہی تھی۔ چنانچہ اس بے خودی کی حالت میں اس کے منہ سے جو فقرات نکلے اس سے بوڑھے شکاری کے دلی کرب کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

”ناز کا وہ درخت جس کے نیچے ہم گھنٹوں بیٹھ کر باتیں کیا کرتے۔ آئندہ کے سہانے خواب دیکھتے اور شکار کا گوشت بھون کر کھایا کرتے تھے۔ اب بھی اسی طرح کھڑا ہوا ہے، لیکن ہر طرف ایک اداسی کا عالم طاری ہے۔ وہی چھوٹا سا خوب صورت بنگلہ جو کسی زمانہ میں جنت ارضی معلوم ہوتا تھا، اب کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ میں اس خیال سے وہاں گیا تھا کہ زندگی کے باقی ایام اسی ماحول میں گزاردوں اور اسے تھر کے پہلو میں دائمی نیند سو جاؤں لیکن یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ چند ہی روز میں ایسی وحشت ہوئی کہ کھانا پینا حرام ہو گیا اور دوستوں نے یہ حال دیکھ کر مجبور کر دیا کہ انگلستان واپس چلا جاؤں۔ اب آپ میری مایوسی کا اندازہ لگا سکتے ہیں لیکن میں آپ کو مایوس نہیں کرنا چاہتا اور شکار کے دو تین ایسے واقعات سناتا ہوں جس سے آپ کو اس عظیم جانور کی فطرت کا بہت کچھ اندازہ ہو جائے گا۔

افریقہ کے مغربی ساحل پر پرگنالیوں کی ایک نوآبادی اٹگولا ہے۔ یہاں میرا ایک دوست ڈی سلوا فریدہ کے علاقے کا گورنر تھا۔ ایک دن اس کا تار ملا کہ معاملہ ایک ہاتھی کا ہے جس نے تمام علاقے میں تباہی مچا رکھی ہے۔ چنگھاڑتا، دہاڑتا، دندناتا پھرتا ہے۔ بندوق کی گولی کا اس پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بارود کی بودود سے سوگھ لیتا ہے اور جنگلوں میں ایسا غائب ہوتا ہے کہ پھر ہفتوں تک نظر نہیں آتا۔ اس سے بھی زیادہ یہ کہ کالوں اور گوروں کو خوب پہچانتا ہے۔ انہیں تو اپنا وطن سمجھ کر کچھ نہیں کہتا لیکن اگر یورپین نظر آجائے تو اس کی جان کا دشمن

بن جاتا ہے اور اسے موت کے گھاٹ اتارے بغیر دم نہیں لیتا۔ اب تک تو ہم اس کے مظالم کسی نہ کسی طرح برداشت کرتے رہے لیکن کچھ عرصہ سے اس بد معاش نے اپنی آن بانی ہے جو گئے کے کھیتوں کو بری طرح پامال کر رہی ہے۔ یہی ہماری سب سے بڑی معیشت ہے جس کو اس نے تباہ کر رکھا ہے۔ آپ کے سوا اس دنیا میں کوئی ایسا نہیں جو ہمیں اس آفت سے نجات دلا سکے۔ معاوضہ تو خیر جو کچھ آپ لیں گے، دیا جائے گا لیکن آپ کا یہ احسان ہم کبھی نہ بھولیں گے۔

اب سنئے کہ واقعہ کیا تھا۔ کسی اناڑی نے بغیر اس کا تن و توش، قوت و توانائی اور چلت پھرت کا صحیح اندازہ لگائے بغیر اس دیو پر گولی چلا دی اور وہ بھی اس گھبراہٹ میں کہ نشانہ خطا ہو گیا اور صرف اس کے بانس پاؤں میں ہلکا سا زخم آ گیا جس سے طیش میں بھر کر اس نے شکاری کو تو وہیں ختم کر دیا اور اس کے بعد سے قسم کھائی کہ کسی سفید فام کو زندہ نہ چھوڑے گا اور اب گویا ایک ہاتھی اور پوری یورپین برادری کی جنگ تھی جس میں آخر الذکر کو ہر محاذ پر پسائی ہو رہی تھی اور بقول میرے دوست کے آج کل اس علاقہ کا گورنر وہ نہیں بلکہ ہاتھی بنا ہوا تھا۔

اس جانور کے قد و قامت، عادات و اطوار اور طور و طریق کو اس کے نقش قدم سے بخوبی پہچانا جاسکتا ہے۔ چنانچہ جب میں نے اس کا جائزہ لیا تو یہ چلا کہ وہ بڑا ہی تجربہ کار، ہوشیار اور عیار ہے۔ اس کے پاؤں کی کوئی بڑی ٹوٹ گئی ہے جس کی وجہ سے مستقل طور پر ٹنگ کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کا جذبہ انتقام ابھی تک تازہ ہے اور صرف جان بقیہ پر رکھ کر اس کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ میرے تلاش کرنے سے قبل ہی اس نے مجھے ڈھونڈ نکالا اور اگر میری چھٹی حس بیدار نہ ہوتی تو میں یقیناً اس کے ہاتھوں ہلاک ہو چکا ہوتا۔ ہوا کا زرخ اس کی طرف سے میری جانب تھا۔ اس لیے میں نے دور ہی سے اس کی بوسنگی کی اور ایک اونچے تنادر درخت پر چڑھ گیا۔ ٹھوڑی دیر میں وہ بھی سامنے آ گیا لیکن یا خدا ہاتھی تھا یا پہاڑ۔ انگلستان کے چنیا گھر کا جو بیٹ جس کو بعد میں امریکہ بھیج دیا گیا تھا اور جو ایک چلتی ریل سے ٹکرا کر فٹ ہو گیا۔ ساڑھے گیارہ فٹ اونچا اور ساڑھے چھوٹ وزنی تھا لیکن اس کی اونچائی کسی طرح 13 فٹ سے کم نہ تھی اور وزن بھی ڈیڑھ تو ضرور ہوگا۔ دم بالکل سفید تھی یا سفید ہو گئی تھی۔ کیونکہ اندازے کے مطابق اس کی عمر ڈیڑھ سو سال سے زیادہ تھی اور دانت آٹھ فٹ تو ضرور ہوں گے۔ جن کو فروخت کر کے انسان پوری زندگی عیش و آرام سے بسر کر سکتا ہے۔

اس کو دیکھتے ہی میرے بدن میں لکچھی ہونے لگی، ہوش دھاس جواب دینے لگے، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس موقع پر میں طرح دے جاؤں اور اس سے کوئی تعرض نہ کروں۔ لیکن نہ معلوم کیا ہوا کہ میں نے اس کی پیشانی کا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ جانور کو آپ ہزار حیوان کہہ لیں لیکن ان کی جس ہمارے مقابلے میں بڑی تیز ہوتی ہے۔ ہاتھی کو فوراً خطرہ کا ظلم ہو گیا اور اس نے اس سرعت سے پہلو ہلا کہ گولی دائیں جانب سے ہوتی ہوئی نکل گئی اور اس کا بال تک بیک نہ ہوا۔ اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے میری طرف گھور کر دیکھا۔ قریب آ کر سوئے سے درخت کی جڑ کو ہلایا کہ اکھڑ سکتی ہے یا نہیں اور جب پتہ چلا کہ وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تو پھینکارتا ہوا جھڑیوں کے پیچھے غائب ہو گیا۔ اگر کہیں میں اس کے جھانسنے میں آ کر نیچے اتراؤں تو میری بڑی تک ریزہ ریزہ ہو جائے کیونکہ وہ پاس ہی کھڑا ہوا میرا کئی گھنٹے انتظار کرتا رہا لیکن میں بھی بہر حال آزمودہ کار شکاری تھا اور ان کے داؤ پیچ سے بخوبی واقف تھا۔ آٹھ گھنٹہ مسلسل انتظار کے بعد نیچے اترا۔ جاں بچی سولا کھوں پائے۔

دوسرے مقابلے میں میری گولی اس کے سینے میں پوسٹ ہو گئی لیکن گرنا تو کچھ دیر تو کھڑا یا تک نہیں۔ قدم قدم اطمینان سے چلتا نظروں سے غائب ہو گیا۔ کئی روز تک جنگل میں اس کی لاش ڈھونڈی جاتی رہی مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ پندرہ بیس دن کے بعد خبر آئی کہ لشکرے ہاتھی کے نشانات گئے کے کھیتوں میں پھر دکھائی دینے لگے ہیں اور ایک جرمن سیاح اس کی چیرہ دہتی کا شکار ہو گیا ہے۔ اب وہ مجھے میدانِ عمل میں آنے کی دعوت دے رہا ہے لیکن اس دوران مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس ڈیل ڈول اور قد و قامت کے جانور کی کھال یقیناً اتنی دیر ہو چکی ہوگی کہ اس پر معمولی گولی کا رگرنہ ہوگی، جو شیر اور چیتوں کو با آسانی ہلاک کر سکتی ہے لیکن ہاتھی کے مقابلے میں اکثر بے اثر ہو جاتی ہے۔ چنانچہ میں نے ایک بڑی گولی جو چڑیا کے انڈے کے برابر تھی، ایجاد کی، خود ہی اس کا سانچہ تیار کیا اور خود ہی انڈیس ڈھالا۔ اب تو یہ عام ہو گئی ہے اور چار یا ڈیڑھ ٹن کھلاتی ہے۔

پہلے چند ہاتھیوں پر اس کا تجربہ کیا جو توقع سے زیادہ کامیاب رہا پھر ایک بڑی راکٹل بنوائی جو بیک وقت تین گولیاں چلا سکے اور اس سامان سے لیس ہو کر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ دیہات میں ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا گیا اور دور دور تک کا علاقہ خالی کر لیا گیا۔ اسکولوں میں چھٹی کر دی گئی اور لوگوں سے کہا گیا کہ گھروں میں بیٹھیں اور بلا ضرورت باہر نہ نکلیں۔ پھر پتہ لگایا گیا کہ قرب و جوار میں گئے کے کھیت کہاں کہاں ہیں اور ان کے نزدیک پانی کا ذخیرہ کہاں کہاں ہے۔ کیونکہ ہاتھیوں کی عادت ہے کہ کھانے کی تلاش یا دریا پر جاتے اور نہاتے ہیں۔ خوش قسمتی سے ان کے اس مقررہ راستے پر چند تنادر درخت موجود تھے جن میں سے ایک پر میرے لیے آرام دہ اور محفوظ چھان بنادی گئی اور میں دوسرا تھیں سمیت اس پر راجحان ہو گیا۔ ہوا ساکت تھی جس کی وجہ سے ہماری بوباس اوپر سے نیچے نہیں پہنچ سکتی تھی اور اس طرح بھی ہم محفوظ تھے۔ رات کچھ سوتے کچھ جاگتے گزاری، معمولی سی آہٹ یا پتہ کی کھڑکھڑاہٹ سے آنکھ کھل جاتی تھی۔ دن چڑھنے کو تھا کہ موذن نے جنگل سے اذان دی۔ پھر چرندے چہچہانے لگے، آخر آفتاب کی کرنوں نے بھی درختوں کی چوٹیوں کو جھلکا نا شروع کر دیا اور ہم پاپوس ہو کر واپس جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ وہ دیو قامت عفریت دور سے آتا دکھائی دیا اور چند منٹ میں بالکل ہی نزدیک آ گیا۔ سامنے سے پیشانی پر نشانہ لگانا ممکن نہ تھا۔ اس لیے میں نے کپٹی کوتا کا اور گولی چلا دی، جو کارگر ثابت ہوئی، خون کا ایک فوارہ چھوٹ نکلا، لیکن خدا معلوم کس قسم کے گوشت پوست کا بنا ہوا تھا کہ نہ گرنا نہ کھڑا یا اور میری طرف دیکھنے لگا، اس طرح اس کا زرخ بالکل سامنے ہو گیا، یہ بات میرے لیے مفید تھی، کیونکہ اب میں پیشانی کو نشانہ بنا سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے فوراً دوسری گولی چلا دی جس سے اس کا بھیجا پاش پاش ہو گیا اور اس طرح انگوٹھی کی سرزمین ہمیشہ کے واسطے اس موذی کے ظلم و ستم سے پاک ہو گئی۔

عکراں قوم نے آزادی کا سانس لیا اور میرے اوپر پھولوں، رو پیسے اور زور و جواہر کی بارش ہونے لگی۔ اسکے علاوہ مال غنیمت میں ہاتھی دانت حاصل ہوئے، ان کی قیمت کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہے۔ کبھی آئیں تو میرے عجائب خانے میں ان کو ضرور دیکھئے گا۔

کوئی پیشہ ور صحافی ہوتا تو خدا معلوم اس باہر فن سے کیا کیا سوال کرتا اور جواب میں کیسے کیسے نایاب موتی گود میں سمیٹ لیتا۔ میں ٹھہرا اناڑی، اس کو چہ سے بالکل ہی نا آشنا۔ اس لیے ایک بے تک سوال کر بیٹھا کہ کیا آپ کو کبھی ہاتھی کے مقابلے میں ناکامی کا بھی منہ دیکھنا پڑا۔

میرا خیال تھا کہ اس پر وہ کچھ جزبہ ہوگا، کچھ ناک بھوں چڑھائے گا، ممکن ہے کہ ڈانٹ بھی دے لیکن اس نے اپنے پو پلے منہ سے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور لگا کہنے کیا آپ نے نہیں سنا کہ شہسوار کبھی نہ کبھی جتنی کھاتا ہے۔ مجھے بھی ایک ہاتھی کے مقابلے میں منہ کی کھائی پڑی۔ یہ بھی جنوبی

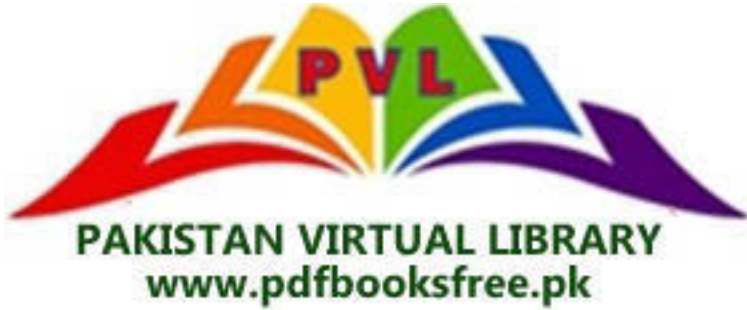
پرانے کا اتفاق ہوتا تھا تو ہوتو جنگل کو نکل جاتا۔ دنوں ادھر ادھر گھومتا، پھر خود ہی آ جاتا۔ ایک مرتبہ وہ مست ہو گیا۔ مستی اس جانور کا ایک ایسا مرض ہے جس کی علت غائی آج تک کسی کی سمجھ میں نہ آ سکی۔ کچھ غدد ہوتے ہیں جو پھول جاتے ہیں اور جانور کی طبیعت ہی بدل جاتی ہے۔ وہ ہر ایک کا دشمن اور خون کا پیاسا ہو جاتا ہے، ہلاک کرنے اور پیروں سے روندنے میں اسے لطف آنے لگتا ہے اور لوگوں کی جان خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔ ابھی تک اس کا صرف ایک ہی علاج دریافت ہوا ہے کہ اسے گولی مار دی جائے۔ چنانچہ مرنے کے بارے میں بھی یہی فتویٰ صادر ہوا اور پیٹرولس کو اس کام پر متعین کیا گیا جس کا شکاریوں میں بڑا نام تھا۔ اس نے اپنے دُغم میں گھوڑے پر سوار ہو کر مقابلہ کرنے کی ٹھانی۔ لیکن تقدیر مخالف تھی۔ نشانہ خطا ہو گیا اور قبل اس کے کہ دوسرا وار کرے، ہاتھی نے اسے جالیا۔ گھوڑے کو تو اٹھا کر دوڑ پھینکا جس سے اس کی مکروٹ گئی، پھر سوار کو اس طرح کچلا کہ ہڈی ہلکی سرمہ ہو گئی، دیر تک غصہ سے چنگھاڑتا رہا۔

آس پاس جو لوگ تھے، خوف سے کاہنے لگے جس سے ہوسکا درخت پر چڑھ گیا جو رہ گیا وہ ساکت لیٹ گیا کیونکہ اس جانور کی فطرت ہے کہ بھاگنے والے کو اپنا دشمن سمجھتا ہے اور اسے ضرور ہلاک کرتا ہے۔ کچھ دیر تک چنگھاڑتا رہا، پھر چشمہ پر جا کر نہایا اور تازہ دم ہو کر اسی جگہ لوٹ آیا۔ کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا کہ لاش کے ساتھ کیا عمل کیا جائے۔ آخر درختوں سے ٹہنیاں توڑیں اور ان سے اسے ڈھک کر چلا گیا۔ اس روز تو کسی کو نزویک آنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اگلے دن سرکاری عملے کے لوگ آئے تو دیکھا جسم قیدہ ہو چکا ہے اور اسے کسی طرح لاش نہیں کہا جاسکتا۔ اس لیے طے کیا گیا کہ اسی جگہ قبر کھود کر جو کچھ باقی رہ گیا ہے، اسے دفن کر دیا جائے۔ لیکن آپ اس جانور کی کینہ توڑی ملاحظہ کیجئے کہ دو تین دن بعد جب اس کا ادھر سے گزر رہا تو اس نے قبر کو سونگھ کر اس کے چہرے کو منہ پر کر دیا اور آج بھی کئی سال گزرنے کے بعد لوگ بتاتے ہیں کہ وہ قبر پر گاہے گاہے آتا اور گرد و پیش میں جو پودے اگ آتے ہیں ان کو تہس نہس کر کے چلا جاتا ہے۔ مقامی لوگ کہتے ہیں کہ اس میں کوئی بدروح آگئی ہے اور اب یہ کسی بندوق یا رافٹل سے ہلاک نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے چاندی کی گولی درکار ہوگی۔

بہر حال میں نے بھی دو مرتبہ قسمت آزمائی کی۔ ایک دفعہ تو وہ مجھے دیکھتے ہی فرار ہو گیا اور میری ساری چابکدستی دھری کی دھری رہ گئی۔ دوسری بار اس نے خود مجھے بے خبری میں آن لیا اور سوئڈ میں لے کر اتنا اونچا اچھالا کہ اگر زمین پر گرنا تو یقیناً جسم پاش پاش ہو جاتا لیکن قسمت نے عجیب طرح یادری کی اور میں ایک تناور درخت کی شاخوں پر جا گرا۔ جہاں سے اوپر چڑھ جانا آسان تھا۔ کوئی اور ہوتا تو اس کے اوسان خطا ہوجاتے لیکن میری عمر تو اسی دشت کی سیاحتی میں گزری تھی۔ فوراً ہی چوٹی تک پہنچ گیا اور لگا اس عفریت کا منہ چڑانے، دشمن نے بھی کوئی داؤد نہ چھوڑا، ہر طرح سے کوشش کی کہ درخت کو گرالے، لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ دوراتیں اور دو دن میں اوپر اور وہ نیچے موقع کا انتظار کرتے رہے۔ آخر تھک ہار کر وہ چلا گیا اور پھر کبھی نظر نہ آیا۔ اس مرتبہ جو میں افریقہ گیا تو معلوم ہوا کہ وہ موذی ابھی تک زندہ ہے اور کوئی سال ایسا نہیں جاتا کہ اس کے نامہ اعمال میں دو چار انسانوں کا خون نہ لکھا جاتا ہو۔ حکومت عاجز ہے اور لوگ پریشان۔ اب اس کی فطری موت ہی انہیں اس مصیبت سے نجات دلا سکتی ہے۔

شکاری نے پھر ایک شہنڈی سانس لی اور کہنے لگا۔ ”میری بیٹیاں اب بھی کار تو سوں سے بھری ہوئی ہیں، بندوقیں اب بھی اپنا دہانہ کھولنے کو تیار ہیں، لیکن ہاتھ پاؤں شل ہو چکے ہیں، دل مردہ ہو گیا ہے اور میں خود اپنی شکست کی آواز بن کر رہ گیا ہوں۔ آپ کا اگر کبھی میرے غریب خانے

ہاتھی کے شکاری کی یہ داستان اتنی عجیب تھی کہ دونوں میں سے کسی کو بھی وقت کا اندازہ نہ ہو سکا اور رات کے کھانے کی گھنٹی بجنے لگی اور ہم اس طرح چوک پڑے جیسے کسی نے بڑے خوب سے بیدار کر دیا تھا۔



آدم خور کا تعاقب

میرا نام راؤ سوراج سنگھ ہے۔ میں سینکڑا اکل لائبر میں رسالدار ہوں۔ میں اس روز بیٹھک میں بیٹھا سوچوں میں غرق تھا۔ وہی آدم خور میرے خیالوں کا مرکز تھا جو ستر انسانوں کو ختم کر چکا تھا۔ کل ہی اس نے ہمارے گاؤں کے ایک سارنگت رائے کو چٹ کیا تھا۔ میں کئی شیر ہلاک کر چکا تھا مگر وہ قاتل ابھی تک زندہ تھا۔ دفعہ قدموں کی چاپ نے میرے خیالوں کو منتشر کر دیا۔ ایک قومی بیکل جوان نے آکر اپنا تعارف کرایا۔ میرا نام بیت خاں ہے۔ میں سرحدی پٹھان ہوں۔ 18 پوناہارس میں رسالدار ہوں۔ مجھے آپ کے دوست رسالدار راؤ عباس علی خاں نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ مجھے سیر و شکار کا بہت شوق ہے۔

میں نے آدم خور کے بارے میں پوری روداد بیان کی تو انہوں نے کہا، ”راؤ صاحب خدا مدد کرے گا۔ ہمارا علاقہ چتوڑ سے آگے سرسبز پہاڑوں اور ہری بھری شاداب وادیوں پر مشتمل ہے۔ یہ سارے کا سارا خونی درندوں کا مسکن ہے۔“

دوسرے دن صبح بھیلوں نے آکر بتایا، ”راؤ صاحب۔ سنگت رائے کی نصف لاش مل گئی ہے۔ پہاڑ کے دامن میں ایک نشیب میں پڑی ہے۔“ ہم نے قریب ہی پھان تیار کیا اور سورج غروب ہوتے ہی کھانے سے فارغ ہو کر پھان پر جا بیٹھے۔

بیت خاں رانقل لیے خاموش بیٹھا تھا اور میں طرح طرح کے خیالوں میں گم تھا۔ ذرا سا کھکا ہوتا اور میرے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ جاتی۔ حقیقت یہ ہے کہ میں انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔ قریب ہی ایک جنگلی مرغ صبح صادق کا انتظار کیے بغیر اذان دینے جا رہا تھا۔ ساتھ ہی گیندروں کی کوہو اور موروں کی پہو پہو نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ یکا یک سناٹا چھا گیا جیسے تمام کائنات کو ناگ نے ڈس لیا ہو۔ دس بارہ سانہر دوڑتے ہوئے آئے اور پھان کے قریب سے چوڑیاں بھرتے ہوئے غائب ہو گئے۔ میں سمجھ گیا کہ آدم خور آ رہا ہے۔ بیت خاں نے سرگوشی میں کہا ”راؤ صاحب، پہلا فائر مجھے کرنے دیں۔“ اچانک بلا کے سناتے میں ہڈی ٹوٹنے کی آواز نے بدن میں جھرجھری پیدا کر دی۔ معائنہ رچ روشن ہوئی اور بیت خاں کی رانقل نے شعلہ اگلا۔ گولی شیر کی پیشانی توڑتی ہوئی دور نکل گئی۔ وہ سنگت رائے کی نصف لاش پر گرا اور پلک جھپکتے میں اٹھ کر جست لگائی اور پھان سے ٹکراتا ہوا سانسے گر گیا۔

بیت خاں نے دوبارہ فائر کیا، گولی گردن میں سوراخ کرتی ہوئی پارنکل گئی۔ شیر پھر کودا اور وہیں گر کر خنڈا ہو گیا۔ بیت خاں بڑے غضب کا نشانہ باز تھا۔ ہم دونوں سنگینیں تانے پھان سے اترے تو شیر مرچکا تھا، لیکن یہ عام شیر تھا جس ظالم کا پورے علاقے میں چرچا تھا، وہ نہیں تھا۔ دن نکلنے ہی بھیلوں نے آکر شیر کی کھال اٹاری تو سامنے دس بارہ بھات آکر رونے لگے۔ ایک نو جوان کو ٹوٹنی کے دورے پڑ رہے تھے۔

ایک بھات نے بتایا، ”راؤ صاحب، اس نو جوان کی شادی کو دس دن گزرے ہیں۔ آدم خور پن گھٹ سے نو بیاہتا دلہن کو اٹھا کر غائب

ہو گیا، لیکن چشم دید گواہ کوئی نہیں ہے۔ شیر گاؤں کے چار انسانوں کو پہلے چٹ کر چکا ہے۔“

میں نے شک کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ دلہن کسی بدکار کے ساتھ فرار ہو سکتی ہے، لیکن بھانوں نے یقین دلایا کہ دلہن بے حد شریف اور شرمیلی ہے۔ اس کے فرار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ شیر پہاڑ سے پن گھٹ کے قریب اترتا ہے اور انسان کا شکار کر کے غائب ہو جاتا ہے۔ تاہم میرے دل میں طرح طرح کے خدشات ختم لے رہے تھے۔

بالآخر میں اور بیت خاں دلہن کے قاتل آدم خور کی تلاش میں چل پڑے۔ اور ایک بھات کے ہاتھ شیر کی کھال گھر بھیج دی۔ ہم پہاڑ پر چڑھے اور پن گھٹ کے دوسری طرف اتر گئے، وہاں گاؤں کے لوگ موجود تھے۔ عورتیں بین کر رہی تھیں۔ لوگوں نے بتایا کہ آدم خور صبح دلہن کو اٹھا کر لے گیا ہے۔ ہم نے غور سے دیکھا تو شیر کے پنجوں اور خون کے نشانات دور تک جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ نشانات کے ساتھ ساتھ چل دیے جو پہاڑ کے نیچے بائیں طرف گھنے جنگل میں داخل ہو رہے تھے۔ جنگل میں داخل ہوتے ہی مجھے احساس ہوا کہ آدم خور چند گھنٹوں کے وقفہ سے دوسرے آدمی کا شکار نہیں کر سکتا۔ یہی خیال بیت خاں کا تھا، اب یہ خیال پختہ ہو گیا کہ یقیناً دلہن کسی آوارہ شخص کے ہمراہ فرار ہوئی ہے۔ ہم بھوکے پیاسے آدم خور کے تعاقب میں چلے جا رہے تھے۔ صرف ایک سہا ہوا بھات ہمارے ساتھ تھا۔

دو پہر ڈھل چکی تھی۔ آسمان پر بادل چھا گئے اور اچانک تیز ہند برسنے لگا۔ پورے تین گھنٹے بعد بارش بند ہوئی۔ گرد و غبار دھل کر درختوں پر بہا رہا گئی۔ ہم بری طرح بھیگ چکے تھے۔ نشانات غائب ہو چکے تھے۔ یہ ہماری مہم کا بہت بڑا المیہ تھا۔ بادل خواست ہم پھر گھنے جنگل میں آدم خور کو تلاش کرنے میں جت گئے۔ بائیں جانب دیکھا، دس بارہ فٹ لمبے دوکالے ناگ نظر آئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک نیولہ ان پر حملہ آور ہوا۔ دونوں ناگوں نے پھن اٹھا کر نیولے کو ڈسنے کی کوشش کی لیکن وہ کمال پھرتی سے وار بھا گیا۔ نیولے نے پھر حملہ کیا، بڑی بڑ لطف جنگ تھی۔ ناگ زمین پر پھن مار مار کر تھک چکے تھے لیکن نیولہ تازہ دم اور پرسکون تھا۔

اس کے جسم میں بلا کی پھرتی تھی۔ دونوں ناگ اپنی آگ میں تپ کر بل کھاتے نیولے کی طرف تیزی سے لپکتے۔ اور اپنے پھن زمین پر مار مار کر ٹھحال ہو جاتے۔ ہم پتھر کے بت بنے، بغیر پلک جھپکائے، اس سنسنی خیز جنگ سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ اچانک قریب ہی ایک جھنڈ سے سہی سہی انسانی آوازیں ابھریں۔ ہم ادھر لپکے اور جھنڈ میں داخل ہو گئے۔ معاً ایک آدمی کے بھاگنے کی آواز سنی، لیکن میں نے تعاقب کر کے اسے پکڑ لیا۔ ابھی اس سے کچھ پوچھنے بھی نہ پایا تھا کہ ایک حسین عورت درختوں کے جھنڈ سے نکل کر شرمائی ہوئی ہمارے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ میں نے گرج دار آواز میں پوچھا، کون ہو تم اور اس سے تمہارا کیا تعلق ہے۔

میرا نام آشا ہے۔ میں قریب کے گاؤں میں بیاہی ہوں اور یہ ہمارے گاؤں کے کہار کا لڑکا ہے۔ بچپن سے ہماری دوستی ہے۔ میں اس کے ساتھ پن گھٹ سے بھاگی تھی۔ میں نے عورت کو بھات کے ساتھ گاؤں کی سمت روانہ کر دیا۔ اس کے انوکھا مسئلہ جلدی حل ہو گیا تھا۔

گھنے جنگل میں ہم آہستہ آہستہ بڑھتے رہے۔ اب شام ہو چکی تھی۔ چند پرندے شکار کیے۔ گیلی باز کو بمشکل جلا کر اس سے ایندھن کا کام لیا اور بارش کا پانی پی کر ایک درخت پر چڑھ گئے۔ مختلف جانوروں کی ملی جلی آوازوں نے ماحول کو خاصا ڈراؤنا بنا دیا تھا پھر جانوروں کی آوازیں مدھم

پڑنے لگیں اور ایک پڑاسرا سنا چاروں طرف چھانے لگا۔ پورا جنگل موت کا خوف ناک روپ دھار رہا تھا۔ ہمیں افسوس تھا کہ ابھی تک شکار کا فطری لطف نہ اٹھا سکے۔

گہنیں دور دور شیر زور سے گرے جے تو سارے جنگل کو سانپ سونگھ گیا۔ ماحول کی ہولناکی میں اضافہ ہو گیا۔ میں اور بیت خاں درخت سے نیچے اترے اور شیروں کی آوازوں کے تعاقب میں چل دیے۔ راستے میں ایک درخت کے نیچے کئی چمیل اور سانپ کھڑے تھے۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی چوڑیاں بھرتے ہوئے غائب ہو گئے۔ اچانک ایک انسانی چیخ بلند ہوئی اور فضا میں ہل چل مچاتی ختم ہو گئی۔ بیت خاں نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

”یقیناً آدم خور نے کسی انسان کا شکار کیا ہے۔“

ہمیں طویل ہولناک اور تاریک جنگل سے نکلتا مشکل ہو رہا تھا۔ انسانی آواز کے ختم ہوتے ہی ہم دونوں لرز کر رہ گئے۔ اچانک ایک ڈراؤنی اور پڑاسرا آواز اندھیرے جنگل میں گونجی جیسے بھوت ایک خاص انداز میں ہمیں ڈرا رہے ہوں۔ بیت خاں تو مسلمان تھا لیکن میں بھی راجپوت ہونے کے ناطے بھوت پریت کا قائل نہ تھا، ہم نے نصف گھنٹے تک اس خوف زدہ آواز کا تعاقب کیا۔ اس پڑاسرا راز کو جاننے میں کامیابی نہ ہوئی۔ بس ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ آواز محض ہمیں خوف زدہ کرنے کے لیے اس جنگل میں مسلط ہے، مگر ہمارا اصل مشن آدم خور کا مقابلہ کرنا تھا۔ ہم اس آواز کی پرواہ کیے بغیر اپنے کام میں جتے رہے۔ ہماری ہم بڑی سخت تھی۔

ڈراؤنا جنگل تھا کہ ختم ہونے کا نام نہ لیتا تھا، خدا جانے کتنی لمبی رات تھی۔ جب خدا خدا کر کے جنگل سے نکلے تو ایک تیز رفتار ندی نے راستہ روک لیا۔ ہم نے ندی کے کنارے کنارے چلنا شروع کر دیا۔ ندی کا پانی اس قدر تیزی سے بہہ رہا تھا کہ اس کی لہروں میں ہاتھی کھڑا رہنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ اچانک پچھلی تاریخوں کا چاند نمودار ہوا تو پورا جنگل نورانی شعاعوں میں نہا گیا۔

صبح صادق تھا۔ بیت خاں نے وضو کر کے نماز ادا کی اور ہم نے پھر ندی کے ساتھ ساتھ سفر شروع کر دیا۔ ندی کے تیز پانی میں چار انسانی لاشیں بہتی ہوئی آئیں اور آگے نکل گئیں۔ ان کے بعد ایک گیڈر بہتا ہوا آیا اور پانی کی لہروں نے اسے کنارے پر پہنچا دیا۔ وہ نڈھال ہو کر سامنے گر پڑا، ہم نے اس کو وہیں چھوڑا اور آگے بڑھ گئے پھر ایک زرد رنگ کا اڑد ہالہروں میں لپٹا نظر آیا اور پلک جھپکتے میں تیز پانی کی لہروں میں جکڑا آگے نکل گیا۔ کچھ دور چلے تو ندی پار ایک چھوٹا گاؤں آباد تھا۔ وہاں چار آدمی ندی کے کنارے کھڑے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ میں نے کہا۔ ”ہم شکاری ہیں اور آدم خور کے تعاقب میں پہاڑوں اور جنگلوں میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔“ ان میں سے ایک بولا ”ہم کشتی لاتے ہیں آج آپ لوگ ہمارے ہاں مہمان رہیں۔“ ہم نے کشتی کے ذریعے ندی پار کی۔ گاؤں والوں نے ہماری بہت خاطر تواضع کی۔ اس گاؤں میں امیر قوم کے لوگ آباد تھے۔ انہوں نے بتایا کہ آدم خور ہمارے دو آدمی ہضم کر چکا ہے۔ رات کے وقت ایک جام قریب کے گاؤں سے آ رہا تھا۔ آدم خور نے اسے ہڑپ کر لیا۔ ہمارے آدمی اس کی لاش کی تلاش میں گئے ہیں۔ شام کو آئیں گے، آپ لوگ سو جائیں۔

دونوں کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ گرم دودھ پیتے ہی ہمیں نیند نے آلیا۔ شام کو آنکھ کھلی تو انہوں نے بتایا کہ پہاڑ کے نیچے ایک گڑھے میں جام کی نصف لاش پڑی ہے۔ ہم نے وہاں ایک مچان تیار کر وا دی ہے۔

شام کو کھانا کھانے کے بعد ہم مچان کی طرف چلے گئے۔ گاؤں کا ایک شخص ہیرالال ہمارے ساتھ تھا۔ اس کے پاس توڑے دار ہندوق تھی۔ ابھی ہم مشکل چند قدم ہی چل پائے تھے کہ ایک کیم شیم آدمی آتا دکھائی دیا۔ وہ وہیں کھڑے ہو کر مجھ سے باتیں کرنے لگا۔ میں نے بتایا کہ میرا نام راؤ سوراج سنگھ ہے۔ میں انگریزی فوج میں رسالدار ہوں۔

وہ بولا ”راؤ صاحب! میں آپ کے ساتھ مچان پر بیٹھتا لیکن آپ کو پتہ ہے کہ راؤ اور رانا یکجا شکار کھیلے تو ضرور خون ریزی ہوتی ہے۔“ اتنا کہہ کر رانا صاحب اپنے گھر چلے گئے اور ہم مچان پر جا بیٹھے۔ میں اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ ذرا سی آہٹ میرے جسم میں سنسنی دوڑا دیتی تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ یکا یک چوپائے بھاگتے ہوئے آئے۔ بیت خاں نے نارچ جلائی۔ وہ سب سانپ تھے۔ بہت پریشان اور گھبرائے ہوئے ہمارے قریب سے گزرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ جام کی پکی پکی لاش ہمارے سامنے گڑھے میں پڑی تھی۔ دور سے شیر کی گرج سنائی دی اور کچھ دیر بعد آدم خور بے قدموں آتا دکھائی دیا۔

اس کی اچانک آمد سے ہم سناٹے میں آ گئے۔ اس سے پہلے کہ ہم سنبھل پائیں، وہ جام کی نصف لاش اٹھا کر چل دیا۔ بیت خاں نے نارچ جلائی اور میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ بے قراری کی حالت میں، میں نے لمبی دہائی، بیت خاں کا زکرنے کے لیے پہلے ہی تیار تھا۔ ایک ساتھ دو دھماکے ہوئے، دونوں گولیاں شیر کا پیٹ پھاڑتی ہوئی نکل گئیں۔ وہ کہری شیر تو نہیں تھا مگر تو انائی اور قد کاٹھ میں اس کا مقابلہ تھا۔ لاش کا نصف حصہ چھوڑتے ہی پلٹا اور حسرت مار کر مچان کے نزدیک لہراتا ہوا نیچے گرتے ہوئے غائب ہو گیا۔ بڑا عیار درندہ تھا، میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ جنگل کا شہنشاہ ہمیں بے وقوف بنا کر بھاگ جائے گا۔

ہیرالال بولا۔ ”اس بلا کا یہی انداز ہے۔ شاید نشانہ چوک گیا۔“

بیت خاں نے بڑے پرسکون لہجہ میں کہا ”دونوں گولیاں اس کے بدن کے پرچے اڑاتی ہوئی نکل گئی ہیں۔“ ہم سنگین تان کر مچان سے نیچے اترے۔ لہو کا نشان ہماری رہنمائی کرتا ہوا گھٹنے جنگل کی طرف جارہا تھا۔ ہیرالال گھبرا گیا کہ میں زخمی شیر کا دوبدو مقابلہ دیکھنے کی تاب لانے سے رہا۔ میں واپس اپنے گاؤں جارہا ہوں اور وہ چلا گیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔ ہیرالال کا یہ فیصلہ درست ثابت نہ ہوا۔ ہوا یوں کہ آدم خور کی راستے میں ہیرالال سے مڈبھڑ ہو گئی۔ شیر نے اسے وہیں دبوچ کر اس کا کام تمام کر دیا اور اس کی لاش اور ہندوق وہیں پڑی رہی۔ ہم تمام رات زخمی آدم خور کے تعاقب میں پھرتے رہے۔ صبح تھک ہار کر امیروں کے گاؤں کے قریب پہنچے تو وہیں ہیرالال کی لاش پڑی تھی۔ اس کی توڑے دار ہندوق گاؤں والے لے گئے جو بھری ہوئی تھی اور ہیرالال کو اسے استعمال کرنے کی مہلت ہی نہیں مل سکی تھی۔ لاش کے گرد لوگ جمع تھے، پھر وہ روتے پینتے لاش اٹھا کر گاؤں کو چل دیے۔

اگلے روز صبح بیدار ہوئے اور ناشتے کے فوراً بعد اپنے مشن پر روانہ ہو گئے۔ آدم خور کے بچوں کے نشان ندی کے ساتھ ساتھ جاتے دکھائی دیے۔ آگے پھر لی زمین آئی۔ بچوں کے نشان غائب ہو گئے۔ تھوڑی دور چلے تو خوف ناک جنگل آیا جو پہلے جنگل سے بھی زیادہ تاریک اور ڈراؤنا تھا۔ زخمی شیر بڑا خطرناک، انتہائی قوت برداشت کا مالک دکھائی دیتا تھا۔

وہ ہمارے لیے ایک سنگین مسئلہ بن چکا تھا۔ اندھیرے جنگل میں آگے بڑھے تو بڑا وحشیانہ منظر تھا۔ پورا جنگل چھوٹی بڑی پہاڑیوں سے اٹا ہوا تھا۔ جگہ جگہ جنگلی مرغ آپس میں لڑ رہے تھے۔ دس بارہ بھیڑیوں نے غار سے نکل کر ہم پر حملہ کیا۔ ہم نے ایک ساتھ دو فائر کیے۔ دھماکوں کی ہولناک آواز کے ساتھ دو بھیڑیے تڑپ کر ٹھنڈے ہو گئے۔ باقی دوڑ کر غاروں میں جا چھے۔ پورے جنگل پر سناٹا چھا گیا۔ آدم خور کی موجودگی میں دوسرے درندے اس طرح آزاد نہیں رہ سکتے۔

جنگل کے بادشاہ کی موجودگی میں چڑیا تک خوف زدہ رہتی ہے۔ شیر شدید زخمی تھا، خدا جانے کدھر نکل گیا۔ اس کا تعاقب ہمارے لیے بڑا مہنگا ثابت ہو رہا تھا۔ جنگل میں تاریکی تھی۔ دن ڈھلے جب اندھیرا اور بڑھا تو ہم ایک پہاڑی پر چڑھ کر دوسری طرف اتر گئے۔ اس جنگل میں سیاہ رنگ کے سانپ ہی سانپ تھے۔ ہمارے پاؤں میں فوجی بوٹ تھے۔ اس لیے قدرے محفوظ تھے۔ درختوں پر بھی ناگ دکھائی دے رہے تھے۔ ناگوں میں صفت ہے کہ وہ چھیڑے اور پاؤں تلے دبے بغیر وار نہیں کرتے۔ ہیبت خاں بولا۔ ”راؤ صاحب سانپوں میں شیر کا کیا کام، ہمیں اس موت کے جنگل سے دن غروب ہونے سے قبل نکل جانا چاہیے۔“

ہم دونوں تیز رفتاری سے چل پڑے۔ آگے بڑھے تو ران جھٹے موٹے سیاہ ناگوں نے ایک چھینل کو ہلاک کر کے کھانا شروع کیا ہوا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی انہوں نے اپنے ایک ایک فٹ چوڑے پھن پھیلا کر ہماری طرف تیز نہ چھپکنے والی آنکھوں سے دیکھا اور اپنی زبان اندر باہر کر کے ہمیں ڈرانے لگے۔ ہم نے رائفوں سے فائر کرنے کا ارادہ کیا لیکن شیر کا خیال آتے ہی اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ ہم خاموشی سے سانپوں اور اڑدھوں کی باشاہت کی حدود سے آگے نکل گئے۔ سامنے ایک تالاب تھا، وہاں رائفوں کے بٹ دھوئے اور غور سے دیکھا تو تالاب کے پانی میں بھی سیاہ ناگ تیر رہے تھے۔ خدا کی پناہ بڑا خوف ناک اور ہیبت ناک جنگل تھا۔ آگے ایک تالے پر وضو کر کے ہیبت خان نے نماز ادا کی۔ میں نے چاروں طرف دیکھا، کوئی جاندار نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس مخصوص جنگل پر صرف ناگوں کی حکومت ہے۔

ہمیں اپنی منزل کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ آگے ایک تاریک سرنگ تھی۔ اس میں بھی بڑے بڑے سانپ رینگ رہے تھے۔ یہ سرنگ کے دہانے کا ذکر ہے۔ سرنگ کے اندر بھگوان جانے کیا بلائیں تھیں۔ آگے بڑھے تو ادھر ادھر پہاڑیاں تھیں۔ ہم ایک پہاڑی پر چڑھے، وہاں بھی خون خوار سانپ بہت سے درختوں پر چڑھے غر مستیاں کر رہے تھے۔ ان زہریلی بلاؤں سے بچتے بچاتے، ہم بائیں طرف سنگلاخ چٹانوں پر اتر گئے، نیچے اترے تو آگے ندی آگئی۔ ہم ندی کے ساتھ ساتھ چلنے لگے اور ایک مقام پر ندی پار کر کے ناک کی سیدھ میں چل پڑے۔ دو میل آگے صدیوں پرانا ایک مکان تھا۔

اس پر بھیلوں کا قبضہ تھا۔ ہم وہیں چار پانی پر بیٹھ گئے۔ بھیلوں سے سانپوں کا ذکر کیا۔ انہوں نے گھبرائی ہوئی آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھا اور کوئی جواب نہ دیا۔ انہیں اس بات کا یقین نہیں آ رہا تھا کہ ہم ان خون خوار سانپوں کے زہن سے زندہ نکل کر آئے ہیں۔ شاید وہ لوگ ان خوف ناک ناگوں کو غیر مرئی قوت سمجھتے تھے اور ان کی گرفت سے بچ نکلنا ان کے نزدیک ناممکن تھا۔ کافی دیر بعد ہم انہیں اس بات کا یقین دلانے میں کامیاب ہوئے کہ ہم واقعی زندہ ہیں۔ وہاں پانی کا عجیب شور تھا۔ شور کے بارے میں پوچھا تو بھیلوں نے بتایا کہ پہاڑ کے پیچھے ایک بہت تیز رفتار

ندی ہے جس کی خوف ناک لہریں پہاڑ سے نگرانی گزرتی ہیں۔ یہ وہی شور تھا، اگر باقی لہروں میں پھنس جائے تو نیکے کی طرح بہتا ہوا غائب ہو جائے اور یہ ریت کے پہاڑ نما نیلے پہاڑوں کے ساتھ ساتھ پتنگڑوں میل میں پھیلے ہوئے ہیں، یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ سورج مغرب میں پہاڑ کے پیچھے غروب ہونے لگا۔ شفق کی خوں رنگ سرفی ہرے بھرے پہاڑوں پر لہو کی طرح پھیلی تو بے حد دل کش اور حسین مناظر سے طبیعت میں خوشی اور مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ تھوڑی دیر بعد گھپ اندھیرا پھیل گیا، ناچار رات وہیں بسر کی۔ صبح ہم پہاڑ پر چڑھے اور نیرنگی قدرت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے دوسری طرف اتر گئے۔ آگے ندی سینہ تانے بہہ رہی تھی۔ اس کی تیز لہروں میں چو پاؤں کی لاشیں بجلی کی رو کی طرح گزر رہی تھیں۔ اب ہم ناگوں کا علاقہ اور آدم خور کو بھول چکے تھے اور ہماری منزل بھٹک چکی تھی۔

میں نے راجستھانی راجپوت ہوتے ہوئے بھی کسی شکاری مہم میں ان علاقوں کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ہم ندی کے کنارے کنارے چل رہے تھے، جو بڑی ہیبت ناک اور پراسرار آواز کے ساتھ بہہ رہی تھی۔ پانی کا شور اس قدر تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ ہماری زبانیں گنگ ہو چکی تھیں لیکن میرا ذہن بیدار تھا اور آگے بڑھے تو مینا قوم کے لوگوں کا گاؤں آیا۔ یہ لوگ سخت متعصب ہوتے ہیں۔ ان کے چالیس اونٹوں کی قطار چل رہی ہو۔ اگلے اونٹ پر کھانا بندھا ہوا اور پچھلے اونٹ سے مسلمان کا ہاتھ لگ جائے تو کھانا بھر شٹ ہو جاتا ہے۔ اپنا اپنا خیال ہے، ہندو راجپوتوں میں تعصب اور مذہبی جنون نہیں ہوتا اور وہ مسلمان سے گھل مل کر رہتے ہیں۔ سامنے سے ایک بڑھیا آتی دکھائی دی۔

میں نے ندی پار جانے کا راستہ پوچھا تو وہ بولی آگے چل کر ندی دو حصوں میں تقسیم ہو کر بہتی ہے اور وہیں ایک کشتیوں کا پل ہے۔ اس سے ندی پار کی جاتی ہے۔ ہم ایک میل اور چلے تو کشتیوں کا پل آیا۔ وہ عبور کیا تو سامنے بنجاروں کے جھوپڑے تھے، ہم جھوپڑوں میں داخل ہوئے تو ایک افسوس ناک اطلاع ہماری منتظر تھی۔ قریب کے جھوپڑوں میں بنجاروں کے عین کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ ایک سسکیاں لیتے بنجارے کو ہم بمشکل گفتگو کرنے پر رضامند کر سکے۔ اس نے روتے روتے بتایا کہ اس کے دو جوان لڑکے رات ”بازے“ کے باہر سو رہے تھے۔ ایک زخمی آدم خور نے ان دونوں پر حملہ کیا اور ان کی ادھ کھائی لاشیں چھوڑ کر بھاگ گیا۔ ایک اور ڈرے سبے ہوئے بنجارے نے جو قریب جھوپڑے میں چھپا یہ دہشت ناک منظر دیکھ رہا تھا ہمیں بتایا کہ وہ آدم خور اپنا کام کر کے چلنا بنا۔

اس کی زبانی ہی ہمیں اس بات کا علم ہوا کہ آدم خور زخمی تھا۔ ہم نے انہیں تسلی دی اور بتایا کہ ہم اسی آدم خور کی تلاش میں یہاں آئے ہیں۔ ہمارے سمجھانے پر وہ بمشکل اپنے ایک آدمی کی ادھ کھائی لاش کو اس جگہ چھوڑنے پر رضامند ہوئے جہاں سے وہ اسے اٹھا کر لائے تھے۔

☆☆☆

ہم لاش کے سامنے ایک درخت پر بیٹھ گئے۔ سورج غروب ہوا اور پہلی تاریکیوں کا چاند نمودار ہوا۔ پورا جنگل دودھیا روشنی میں نہا گیا۔ یکا یک گیڑوں کی بکو اور موروں کی پیہو پیہو نے آسمان سر پر اٹھالیا۔ پھر اچانک پورے ماحول کو سانپ سونگھ گیا۔ ایک دھاڑ گونجی اور آدم خور آتا دکھائی دیا۔ ہمارے اعصاب تن گئے، وہ بنجارے کی نصف لاش کے قریب آیا۔ دم ہلا کر اس نے چاروں طرف دیکھا پھر لاش کو سونگھا، اس کا پیٹ صاف نظر آ رہا تھا۔ زخم مندمل ہو چکے تھے۔ گولیوں کے دوہرے زخم تھے۔ مجھے معاف ایسا محسوس ہوا، وہ درندہ نہیں بلکہ بھوت یا کوئی مافوق الفطرت مخلوق

ہے، لیکن ذہن پر زور دیا تو مسئلہ حل ہو گیا کہ دونوں گولیاں آنت اور اجہری چھو کر کم نقصان دہ جگہ پر سوراخ کرتی ہوئی محدہ کے اوپر سے نکل گئی تھیں اور شیر اسی جگہ سے زندہ تھا، ہم نے دم سادہ کر اس کی حرکات و سکنات پر نگاہیں جمادیں۔ اس نے لاشوری طور پر درخت کی سمت دیکھا، ہماری رائیوں سے دو شعلے نکلے وہ زمین پر گر اور پلک چمکتے میں جست بھر کر درخت سے نکلنا ہوا غائب ہو گیا۔ ایک مرتبہ پھر وہ مکار ہمیں جل دینے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

ہم نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور خطرہ مول لے کر درخت سے نیچے اتر آئے۔ نارچ کی روشنی میں ایک مرتبہ پھر ہم اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ ابھی تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ قریب ہی کسی کی جان لیوا چیخوں سے پہاڑ گونج اٹھے، ساتھ ہی شیر کی غراہٹ سے پورا علاقہ لرز گیا۔ ہم تیزی سے آوازوں کی سمت بڑھے۔ ابھی تھوڑی دور ہی پہنچے تھے کہ ہستی کی طرف سے ایک فحش بھاگتا ہوا ہماری سمت آتا دکھائی دیا۔ غالباً وہ نارچ کی روشنی دیکھ کر ہماری طرف آیا تھا۔ قریب پہنچتے ہی وہ دھڑام سے گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ بیت خان نے اسے کندھے پر اٹھایا اور قریب ہی ایک خالی قطعہ زمین پر لٹا کر اسے ہوش میں لانے کی تدبیر کرنے لگا۔ خدا خدا کر کے اسے ہوش آیا۔ خوف کے مارے اس کا رنگ پیلا پڑ چکا تھا اور زبان لنگ ہو گئی تھی۔ بڑی مشکل سے انک انک کر اس نے ہمیں بتایا کہ اس کا آسانسا مانا ابھی ابھی آدم خور سے ہوا اور بمشکل وہ ایک درخت پر چڑھ کر اس سے بچنے میں کامیاب ہوا ہے۔ وہ بھند تھا کہ شیر کے مرنے تک وہ ہمارے ساتھ ہی رہے گا۔

اتنے خطرناک اور مکار آدم خور کی تلاش رات کے اندھیرے میں کرنا اس کی خوراک بننے کے علاوہ اور کیا تھا۔ ہم نے تعاقب کا ارادہ ملتوی کر دیا اور قریب ہی ایک ٹالے کے نزدیک ایک محفوظ چٹان پر رات گزارنے کا فیصلہ کیا۔ میں اور بیت خان تو تھوڑی دیر بعد ہی نیند کی آغوش میں چلے گئے جب کہ مقامی کہہار خوف کے مارے ہمارے نزدیک ہی بیٹھا رہا۔

ابھی ہمیں سوئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ اچانک کہہار کی چیخوں نے ہڑ بڑا کر اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ بیت خان نے نارچ کی روشنی اس کے چہرے پر ڈالی جس سے تمام خون نچڑا دکھائی دے رہا تھا۔ ایک مرتبہ پھر اس کی حالت بگڑنے لگی۔ بمشکل اس نے ڈرتے ڈرتے ہمیں بتایا کہ ابھی ابھی آدم خور یہاں سے ہو کر گیا ہے، وہ ٹالے کے دوسرے کنارے پر کھڑا ہمیں گھورتا رہا اور کہہار خوف کے مارے چلا بھی نہ سکا۔

اس نے آدم خور کی واپسی کے بعد شور مچایا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ آدم خور ہمت کرتا تو ہمیں سوتے میں شکار کر لیتا، لیکن بھگوان کو ہمیں بچانا مقصود تھا۔ اس لیے شاید آدم خور نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔ ہم نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور اسی وقت جان کا خطرہ مول لے کر اس کے تعاقب میں چل دیے۔ ابھی کچھ دور ہی گئے ہوں گے کہ شیر کی خوف ناک گرج سے فضا لرز گئی۔ اچانک آدم خور گھٹے جنگل سے نکلا اور ہمیں دیکھتے ہی فوراً رُک گیا۔

ہم دونوں لرز اٹھے۔ شیر کی آنکھوں سے انتقام کی آگ برس رہی تھی اور وہ ہم پر جھپٹنے کے لیے تیار تھا۔ ہم نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ایک ساتھ فائر داغ دیے، لمحے بھر کے لیے اس نے اپنا جسم تولا اور زمین پر گر پڑا۔ گولیاں اس کے جسم میں بیوست ہو گئیں، مگر وہ بے حد سخت جان اور دلیر تھا۔ زخمی ہونے کے باوجود جملہ آدہ ہوا۔ میں حیران تھا کہ یہ شیر ہے یا کوئی چھلاوہ، ہم دونوں نے نشانہ لیا، لیکن فائر کرنے کی نوبت نہ آئی۔ شیر جست لگا

کر گھٹے جنگل میں غائب ہو گیا۔ عجیب موسیٰ اور ظالم سے پالا پڑا تھا۔ ہم ان پہاڑوں اور گھٹے جنگلوں سے اکتا گئے تھے۔ روزانہ میلوں کا سفر طے کر رہے تھے۔ طبیعت اب واپس فوجی ہنگاموں میں پہنچنے کو چل رہی تھی، لیکن یہ گوارا نہ تھا کہ شیر سے شکست مان لی جائے۔ ہم ایک مرتبہ پھر تاریک جنگل میں داخل ہو گئے، بس یہی خیال تھا کہ زخمی درندہ بہت چوکنٹا اور ظالم ہوتا ہے۔

ایک ایک آسمان پر گھٹا چھا گئی۔ تاریک جنگل میں اندھیرا اور بڑھ گیا۔ درخت بھوتوں کی طرح ناچ رہے تھے۔ ہم دبے پاؤں آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے، جب اچانک ہم دونوں ٹھٹھک کر رُک گئے، ہلکی سی غراہٹ سنائی دی۔

اس مرتبہ بیت خان نے نارچ کی روشنی شیر پر ڈالی۔ میں بندوق چھپائے فائر کے لیے تیار تھا، لیکن درندہ بے حس و حرکت پڑا رہا۔ ہمیں یقین ہو گیا کہ وہ ظالم ختم ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود ہم خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھے۔ ہم نے شیر پر دو فائر کیے، اس نے ہلکی سی آواز میں غرانا چاہا لیکن آواز آدم خور کے گلے میں انک گئی۔ آگے بڑھے تو وہ نزع کی حالت میں تھا، ہم نے دو فائر اور کیے۔ اب سخت جان اور عیار آدم خور ٹھنڈا ہو چکا تھا۔

ہم ایک قریبی درخت پر چڑھ گئے۔ ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اس مرحلے پر جب ہم مایوس ہو چلے تھے۔ قدرت نے ہماری مدد کی اور اس موسیٰ کی ٹھکانے لگانے میں ہم کامیاب ہوئے۔ صبح صادق نمودار ہوتے ہی میں نے بیت خان کو شیر کی لاش کے قریب چھوڑا اور خود گاؤں کی سمت روانہ ہو گیا۔

جب میں نے گاؤں کے لوگوں کو آدم خور کی ہلاکت کی اطلاع دی تو وہ جوش مسرت سے قص کرنے لگے اور شور مچاتے میرے ساتھ جنگل کی طرف چل دیے۔ ہم نے آدم خور کی کھال اتاری جو بے شمار گولیوں کے سوراخوں سے داغ دار تھی۔ شیر کی کھال لے کر بنجاروں کے جھوپڑوں میں پہنچے تو خوشی کا جشن منایا گیا۔

آدم خور نے جس شخص کا بھائی چٹ کیا تھا، اس نے غصہ میں کھال پر پچاس جو تے رسید کیے، یہ انتقام کا انوکھا طریقہ تھا۔ انہوں نے ہمارے لیے بہترین کھانا تیار کیا۔ ہم کھانے کھاتے ہی سو گئے۔ بیدار ہوئے تو پورے علاقے میں آدم خور کی ہلاکت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔ بے شمار لوگوں نے آکر آدم خور کی کھال دیکھی اور ہمارے گلوں میں پھولوں کے ہار ڈالے۔



شیر، ریچھ اور دریائی گھوڑا

میں ایک جنگل میں شکار کی تلاش میں سفر کر رہا تھا کہ اچانک مجھے چلتے چلتے زکنا پڑا، پیچھے کچھ آواز سنائی دی تھی۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک ریچھ پر نظر پڑی جو دور سے بھاگتا چلا آ رہا تھا۔

میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یا تو ریچھ نے مجھے دیکھ لیا ہے اور اب حملے کی خاطر میری جانب بڑھ رہا ہے یا کسی درندے سے ڈر کر بھاگ آیا ہے۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی لیکن کوئی ایسی جگہ نظر نہ آئی جہاں چھپ کر جان بچا سکتا۔ میرے قریب ہی ایک درخت تھا، میں یہ سوچ کر تیزی سے اوپر چڑھ گیا کہ اگر ریچھ نے ابھی تک مجھے نہیں دیکھا تو یقیناً بھاگتا ہوا، آگے نکل جائے گا اور جب وہ کافی دور چلا جائے گا تو میں نیچے اتروں گا۔ اب میں زمین سے بیس پچیس فٹ کی اونچائی پر تھا، میں سنبھل کر بیٹھ گیا اور ریچھ کو آتے ہوئے دیکھنے لگا۔

ریچھ جب ذرا قریب پہنچا تو میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، وہ اچانک زکا، ایک نظر مجھ پر ڈالی اور نہایت تیزی سے اسی درخت پر چڑھنے لگا جس پر میں تھا، میری جان ہی نکل گئی۔

سوچنے سمجھنے کی سوجھ بوجھ جاتی رہی۔ دل کی دھڑکن خوف ناک حد تک تیز ہو گئی اور جسم میں خون منجمد ہوتا محسوس ہوا۔ یوں معلوم ہونے لگا جیسے ابھی گرنے والا ہوں۔ لیکن ریچھ مجھ پر حملہ کرنے کی بجائے تیزی سے میرے قریب سے گزرا اور ایک دو گز اوپر جا کر ایک موٹی شاخ پر بیٹھ گیا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا۔ بندوق جو میرے ہاتھ میں تھی مجھ پر گرنے سے بچ گئی تھی۔

ریچھ کبھی میری طرف اور کبھی اس طرف جس طرف سے وہ آیا تھا، دیکھتا۔ اب میں نے انداز لگایا کہ ریچھ کچھ بولکھلایا ہوا ہے اور غالباً کوئی درندہ اس کے تعاقب میں ہے، چند لمحوں ہی گزرے ہوں کہ میں نے ایک شیر کو تیزی سے آتے دیکھا۔ اب معمہ حل ہو گیا۔ یقیناً یہی ریچھ کا تعاقب کر رہا تھا۔ اب میں اپنے آپ پر پوری طرح سے قابو پا چکا تھا۔

شیر جب ہم سے چند گز کے فاصلے پر پہنچا تو رگ گیا۔ اس نے شاید ہماری بو پالی تھی۔ شیر نے اپنا بڑا ساسر اوپر اٹھایا اور درختوں کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے جلد ہی ہمیں ڈھونڈ لیا اور غصے میں غرایا۔ وہ خوش بھی ہوا کیونکہ وہ ایک شکار کے تعاقب میں نکلا مگر اب دو شکار اس کے سامنے تھے۔ ایک ریچھ اور دوسرا میں۔ مجھے شیر سے زیادہ خوف محسوس نہیں ہوا کیونکہ میں اتنے فاصلے پر تھا کہ وہ جست لگا کر مجھ تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

شیر ہمارے درخت کے نیچے آ چکا تھا۔ وہ کچھ دیر تو کھڑا ہمیں گھورتا رہا پھر وہیں بیٹھ گیا لیکن اس کی نظریں اب بھی ہم پر جمی ہوئی تھیں۔ اب میرے لیے بڑا پریشان کن لمحہ تھا۔ میں دو درندوں کے درمیان گھرا ہوا تھا۔ شیر کے متعلق میرا خیال تھا کہ وہ کب تک بیٹھا رہے گا، آخر کبھی تو اسے جانا ہی ہوگا۔ کافی سوچ بچار کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ ریچھ کو مار گرایا جائے، ایک تو ریچھ سے جان بچنے کی، دوسرے شیر بھی شاید بندوق کی آواز

سے بھاگ جائے، میں نے فوراً بندوق کی نالی ریچھ کی طرف کر دی۔ ٹرنگر دبانے ہی والا تھا کہ ریچھ نے کمال پھرتی سے نالی کا اگلا سرا پکڑ لیا اور نالی کو نیچے کی طرف جھٹک دیا اور پھر اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔ میں نے دوبارہ بندوق ریچھ کی طرف کی مگر اس بار بھی ریچھ نے بندوق کی نالی نیچے کر دی۔ میں نے کئی بار ریچھ کو ہلاک کرنے کی کوشش کی مگر ہر بار اس نے بندوق نیچے کر دی۔ اس نے چند ایسے اشارے بھی کیے جن سے میں بخوبی سمجھ گیا کہ ریچھ مجھے شیر کو مارنے کے لیے کہہ رہا ہے۔ میں نے ریچھ سے نظریں ملائیں تو اس کی آنکھوں میں استعجاب کی جھلک دیکھ کر مسکرا دیا۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ ریچھ مجھے نقصان پہنچانے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ دوسرے ہی لمحے میں شیر کو ہلاک کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

شیر بدستور سر اٹھائے ہوئے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ میں نے بندوق کی نالی شیر کی طرف کی، سر کا نشانہ لیا اور اللہ کا نام لے کر گولی چلا دی۔ شیر کے سر سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا۔ دوسرے ہی لمحے وہ زمین پر پڑا، مایہ بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ میں نے ایک اور فارغ کیا اور درندہ خاموش ہو گیا۔ اب میں ریچھ کی طرف دیکھنے لگا۔ ریچھ کافی دیر تک خاموش بیٹھا رہا اور شیر کی طرف دیکھتا رہا۔ شاید اسے ابھی تک اس کے مرنے کا یقین نہیں ہوا تھا۔ پھر وہ احتیاط سے آہستہ آہستہ درخت سے نیچے اترا اور ایک طرف کو چلا گیا۔ میں نے سمجھا کہ شاید واپس جانے لگا ہے مگر وہ ایک درخت کی چھوٹی سی سوکھی ٹہنی اٹھا کر واپس آ گیا۔

ریچھ شیر کے قریب آیا اور ٹہنی کا دوسرا سرا شیر کے کان میں زور زور سے گھمانے لگا۔ جب شیر کے جسم میں کوئی حرکت نہ ہوئی تو ریچھ کو یقین آیا کہ واقعی شیر مر چکا ہے میں ریچھ کی اس چالاکی پر بڑا حیران ہوا۔

ریچھ نے شیر کے مرنے کا یقین کر لینے کے بعد ایک دفعہ میری طرف دیکھا جیسے وہ میرا شکر یہ ادا کر رہا ہو اور پھر جس طرف سے آیا تھا، اسی طرف تیزی سے بھاگتا ہوا چلا گیا۔

☆☆☆

اب میں درخت سے نیچے اترا آیا۔ میں بہت جلد دور نکل جانا چاہتا تھا، کیونکہ ڈرتا تھا کہ کہیں ریچھ کی نیت میں فتور نہ آجائے اور وہ دوبارہ آن بیٹھے۔ چنانچہ تیز قدم اٹھاتا ایک طرف چل دیا۔ میں ابھی چند فرائنگ تک ہی گیا ہوں گا کہ پیچھے سے دوبارہ ریچھ کی آواز سنائی دی، میں نے فوراً گھوم کر دیکھا۔ ریچھ کچھ فاصلے سے بھاگ چلا آ رہا تھا۔ اس دفعہ وہ درخت کی لمبی ٹہنی بھی کندھے پر اٹھائے ہوئے تھا۔

میں نے دل میں کہا پہلے تو کسی طرح جان بچ گئی، اب کی بار مارے گئے۔ اب کسی جگہ چھپنا بے سود تھا کیونکہ ریچھ مجھے دیکھ چکا تھا۔ چنانچہ وہاں کھڑا ہوا اور دل میں دعا کی ”یا خدا جس طرح تو نے پہلے بچالیا تھا، اس دفعہ بھی بچالے۔“

ریچھ ہر لمحے نزدیک ہوتا جا رہا تھا۔ بندوق بھی اب خالی تھی، اس سے پہلے کہ میں بندوق بھرتا ریچھ سر پر پہنچ گیا۔ میں یہی خیال کر رہا تھا کہ ابھی ریچھ حملہ آور ہوا چاہتا ہے۔ مجھے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھٹا محسوس ہوا، لیکن یہ کیا! ریچھ ٹہنی میرے پاس پھینک کر واپس بھاگنے لگا، میں نے ٹہنی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور ریچھ کو جاتا دیکھتا رہا۔ جب ریچھ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو ٹہنی کی طرف متوجہ ہوا۔ میں یہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا کہ ٹہنی کے ایک سرے پر شہد کا ایک چھتہ لگا ہوا تھا اور اس پر شہد کی کھیاں بھی نہ تھیں۔ میں نے جب اسے ٹولا تو اسے شہد سے بھرا ہوا پایا۔ یہ شاید

شیر کے ہلاک کرنے کے صلے میں میرا انعام تھا۔

شام ڈھلے تک مجھے اور کوئی بھی شکار نہ مل سکا اور میں نے ایک ایسے غار کو شب بے بسی کے لیے منتخب کیا جس کے قریب ہی ایک بہت بڑی جمیل تھی۔ غار کچھ اونچائی پر واقع تھا، جہاں سے جمیل صاف طور پر نظر آتی تھی۔ غار کے بائیں جانب ایک اونچی پہاڑی تھی، دائیں طرف کی پہاڑیاں زیادہ اونچی نہ تھیں۔ غار کا منہ اور سامنے کا حصہ دن کو تو روشن رہتا لیکن جب سورج غروب ہونے کو ہوتا تو بائیں جانب کی پہاڑی کے سائے کی وجہ سے غار کے اس حصے میں قدرے اندھیرا چھا جاتا، جس کی وجہ سے غار کے منہ پر بیٹھا آدمی تو جمیل اور آس پاس کے علاقے بخوبی دیکھ سکتا تھا مگر جمیل کے نزدیک سے اسے کوئی نہ دیکھ سکتا تھا۔

سورج غروب ہونے کو تھا، میں غار کے منہ پر بیٹھا جمیل اور ارد گرد پھیلے ہوئے ہرے بھرے درختوں کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک ایک شیر درختوں کے پیچھے سے برآمد ہوا۔ وہ خراماں خراماں جمیل کی طرف آرہا تھا۔ غالباً پیاس بجھانے کی فکر میں تھا۔ غار کے منہ پر اندھیرا تھا مگر پھر بھی میں ذرا اندر کو سرک گیا کہ کہیں جنگل کے بادشاہ کی نظر نہ پڑ جائے اور مفت میں کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہو جاؤں۔

شیر جمیل کے کنارے پہنچا اور منہ پانی میں ڈال دیا۔ شیر کو پانی پیتے ابھی چند لمحوں ہی گزرے تھے کہ ایک کالے رنگ والے جانور نے اپنا بڑا سامنہ پانی سے باہر نکالا۔ میں نے اس قسم کا آدمی جانور پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ جانور چشم زدوں میں شیر کو دبوچ کر پانی میں لے گیا۔ پانی میں اُچھل کود شروع ہو گئی اور آدمی جانور اور شیر میں ہاتھ پائی ہونے لگی۔ میں بڑی حیرت سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ زندگی میں پہلا موقع تھا کہ جنگل میں درندوں کے درمیان اس قسم کی لڑائی دیکھنا نصیب ہوئی۔

شیر کئی بار پانی سے ابھرا لیکن دوبارہ دبوچ لیا گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ شیر کا انجام کیا ہوگا۔ میرا تمام جسم لرز رہا تھا اور منہ اور گلا خشک محسوس ہو رہا تھا۔ کچھ دیر تک یونی جنگ جاری رہی اور پانی میں شور و غل مچا رہا۔ آخر کار شیر ایک جھٹکے سے جمیل کے باہر کچھ فاصلے پر آن گرا۔ پانی کے جانور نے اسے باہر نکال دیا تھا، شیر کا بڑا حال تھا۔ اس کے نتھنوں سے خون بہہ رہا تھا، سارا جسم بیہوش ہوا تھا اور کپکپا رہا تھا۔ اس بے چارے کا یہ حال دیکھ کر مجھے بڑا ترس آیا، شیر زمین پر لیٹ گیا اور کافی دیر تک یوں ہی پڑا رہا پھر وہ اٹھا اور سر جھنجھوڑتا ہوا ایک طرف کوچل دیا۔ آدمی درندہ اب شاید زور آزمائی سے کافی تھک چکا تھا یا کوئی زخم کاری کھا چکا تھا اس لیے دوبارہ پانی سے نمودار نہ ہوا۔

میں نے سن رکھا تھا کہ شیر اگر کسی سے مار کھا جائے تو بدلہ ضرور لیتا ہے۔ میں نے دل میں خیال کیا کہ اگر یہ بات صحیح ہے تو شیر کو آزمانے کا اس سے بہتر موقع شاید پھر کبھی ہاتھ نہ آئے گا۔ چنانچہ میں نے اگلے روز بھی اسی جگہ قیام کا فیصلہ کر لیا۔

دوسرے دن جب آفتاب غروب ہونے لگا اور درختوں کے سائے لمبے ہو چلے تو میں غار میں آ بیٹھا اور بے چینی سے شیر کا انتظار کرنے لگا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا، میری بے قراری اور جوش میں اضافہ ہوتا گیا، جس طرف بھی ذرا آہٹ ہوتی میری خنجر نگاہیں ادھر اٹھ جاتیں۔

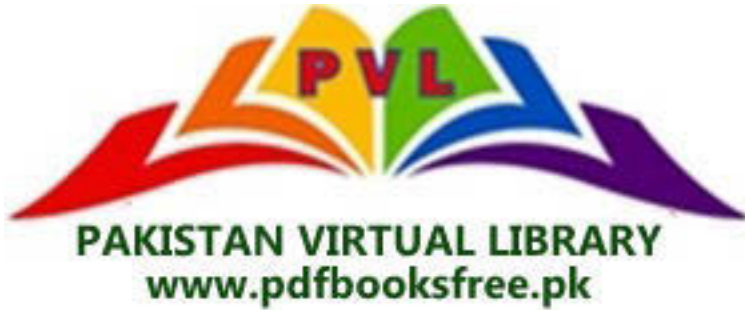
آخر انتظار کی گھڑیاں تمام ہوئیں اور شیر درختوں کی اوٹ سے نکل کر سامنے آ گیا۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی پھیل گئی اور خوشی کے مارے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔ میں نے پہلی ہی نظر میں اس شیر کو پہچان لیا تھا، یہ وہی شیر تھا جس پر کل ایک تاجیجہ جانور نے حملہ کر کے خواہ مخواہ

دشمنی مول لی تھی۔ آج شیر اپنی طاقت کو لوہا منوانے اور اس گستاخ آدمی درندے کو سزا دینے کے لیے میدان میں اتر آیا تھا۔

اب شیر بالکل ہشاش بشاش نظر آرہا تھا اور بے حد جاہ و جلال سے چل رہا تھا۔ اس کے چہرے اور حرکات و سکنات سے محسوس ہوتا تھا جیسے انتقام کی آگ سے بھڑک رہا ہے۔ شیر خاموشی سے قدم اٹھاتا ہوا جمیل کے کنارے پر پہنچ گیا۔ مگر آج پانی نہیں پیا بلکہ مستعدی سے جمیل کے کنارے بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں پانی پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اپنا دایاں پنجہ پانی میں ڈالتا اور پانی کھٹکاتا، شاید اپنے مد مقابل کو سلی کی دعوت دے رہا تھا۔ شیر کو پنجہ پانی میں مارتے ابھی تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ پانی میں جنبش ہوئی اور آدمی درندے نے سر باہر نکالا۔ اس نے سمجھا، شاید آج پھر کوئی شکار اس کا لقمہ بننے کو تیار کھڑا ہے لیکن وہ اس سے بے خبر تھا کہ آج اس کا سامنا شکار سے نہیں بلکہ موت سے ہوگا۔

آدمی درندے نے سر پانی سے باہر نکالا ہی تھا کہ شیر کا طاقتور پنجہ اس کے سر سے ذرا پیچھے پڑا اور دوسرے ہی لمحے وہ جمیل کے باہر پڑا مرغ بھل کی طرف تڑپ رہا تھا۔ شیر نے اسے کئی دفعہ فضا میں اچھالا اور وہ ہر بار زور سے زمین سے ٹکرایا۔ یہاں تک کہ اس کی روح نے اس کے جسم سے رشتہ منقطع کر لیا۔ شیر انتقام لے چکا تھا۔ اس نے ایک زوردار دھاڑ سے نعرہ فوج بلند کیا اور ہٹلنا ہوا درختوں کے پیچھے روپوش ہو گیا۔

شیر نے جس آدمی درندے کو ہلاک کیا، وہ کالے رنگ کے بھینس سے بھی کوئی پانچ چھ گنا بھاری جانور تھا۔ اس کی شکل و شباہت عجیب و غریب تھی۔ اسے دیکھ کر کسی بلا کا سا گمان ہوتا تھا۔



ہار بھی جیت بھی

بھتی کا نام گوشتی تھا۔ لوہے کی مضبوط زنجیر سے اس کا پچھلا پاؤں درخت کے تنے سے بندھا ہوا تھا۔ گوشتی نے خطرے کی بوسنگھ لی تھی اور بار بار اپنے کان پھڑپھڑا رہی تھی اور سونڈ کو حرکت دے رہی تھی۔ کبھی اگلے پاؤں اٹھا کر بلبلانا شروع کر دیتی۔ گوشتی کا مہاوت علی بہادر جو بڑے سے درخت کی ایک سوٹی سی ٹہنی پر بیٹھا چھوٹی کلہاڑی سے پتوں سے بھری نرم نرم شاخیں گوشتی کے لیے کاٹ رہا تھا۔ بھتی کے بلبلانے کو غلط سمجھا۔ اس کا خیال تھا کہ گوشتی بھوک سے بے تاب ہو رہی ہے۔ اس لیے وہ درخت سے اتر آیا اور چند پتوں سے لدی ٹہنی گوشتی کے آگے ڈال کر دوبارہ درخت پر چڑھ کر ٹہنیاں کاٹنے لگا۔ شیر دبے پاؤں بھٹی جھاڑیوں کی آڑ لے کر درخت کے قریب پہنچ چکا تھا اور اب دونوں اگلے بچوں کو سینے علی بہادر پر چلا لگنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ ایک بیک شیر نے جست لگائی اور علی بہادر سمیت درخت کے نیچے آن گرا۔ خوش قسمتی سے علی بہادر شیر کے اوپر گرا۔ اگر کہیں پانچ سو پونڈ وزنی شیر ایک سو تیس پونڈ کے علی بہادر پر گرتا تو اس کی ہڈی پہلی برابر ہوجاتی۔

بھارت کا ”کاربن نیشنل پارک“ جو مشہور زمانہ شیر کے شکاری جم کاربن کے نام پر معنون ہے۔ کم و بیش ایک لاکھ تیس ہزار ایکڑ کے رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ اس پارک کو قائم کرنے کا مقصد شیروں کی نسل کو فہ ہونے سے بچانا ہے۔

1973ء میں جب یہ پارک قائم کیا گیا جو ہمالیہ کے ترائی کے علاقے میں دہرہ دون سے لے کر بنگال کے دریائے برہم پتر تک پھیلا ہوا ہے۔ شیروں کی تعداد سینکڑوں سے گھٹ کر صرف چوالیس رہ گئی تھی۔ یہ تعداد اب پھر نوے سے اوپر پہنچ گئی، کیونکہ اس علاقے میں شیر کے شکار پر مکمل پابندی ہے۔ علی بہادر کو نیشنل پارک میں کام کرتے ہوئے دس برس ہو گئے تھے۔ 1974ء میں علی بہادر گھاس اور چارہ کاٹنے پر ملازم ہوا تھا۔ نیشنل پارک کا ہیڈ کوارٹر دھیکلہ کے قصبہ میں واقع ہے، جہاں کافی تعداد میں جیپ موٹر گاڑیوں کے علاوہ ہاتھی بھی پائے گئے ہیں، کیونکہ ترائی کے خطرناک جنگلوں میں سفر کرنے کے لیے ہاتھی ہی محفوظ خیال کیا جاتا ہے۔ شیروں کی تعداد گننے کے لیے گیم وارڈن ہاتھی پر بندھے ہوئے ہیں بیٹھے ہیں پھر بھی ان کے پاس بھری ہوئی دو تالی بندوق یا کل دار راٹفل ہوتی ہے۔ علی بہادر دو سال تک بطور چرکنا ملازم رہا پھر جب ایک مہاوت کی موت پر آسامی خالی ہوئی تو یہ گوشتی کا مہاوت بن گیا۔ اکثر چرکنا مہاوت کے طور پر کام کرنا جانتے ہیں، کیونکہ ایک ہاتھی پر ایک مہاوت اور چرکنا تعینات ہوتا ہے۔ پچھلے آٹھ برسوں میں علی بہادر سینکڑوں دفعہ گیم وارڈن اخبار نویسوں، فوٹو گرافروں اور باہر سے آنے والے جنگلی جانوروں کے دیکھنے کے شوقین یورپی اور امریکنوں کو گوشتی پر بٹھا کر ترائی کے جنگلوں کی سیر کراچکا تھا۔

☆☆☆

1982ء کے شروع میں ایک دل دوز واقعے سے علی بہادر اور اس کے تمام ساتھیوں پر اس تلخ حقیقت کا اظہار ہو گیا کہ جنگل میں قحوی

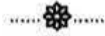
کی لا پرواہی موت سے دو چار کر دیتی ہے۔ اس کا ایک ساتھی چرکنا درگا پر شاد معمول کے مطابق گھاس کاٹنے گیا اور پھر واپس نہ آیا۔ دوسرے دن جب اس کی ڈھونڈ یا پڑی تو کچھ مہاوت وچرکے ایک گیم وارڈن کے ساتھ اس کی تلاش میں جنگل میں گئے اور ایک جھاڑی کے قریب اس کا بچا ہوا سر اور چند چھوڑی ہوئی ہڈیاں ملیں۔ درگا پر شاد کسی بھوکے شیر کا شکار ہو گیا تھا۔ ہڈیوں کے قریب نرم زمین پر شیر کے پاؤں کے نشان پائے گئے۔ عموماً شیر آدمی پر حملہ نہیں کرتا بلکہ اس سے دور ہی رہتا ہے مگر ایک دفعہ شیر کے منہ کو آدمی کا خون لگ جائے تو پھر وہ آدم خور ہو جاتا ہے اور گھات لگا کر انسانوں کو شکار کرتا ہے۔ عموماً عورتیں اور نوجوان لڑکے اس کا شکار ہوتے ہیں۔ جب ہندوستان پر انگریز کی حکومت تھی تو شیر کا شکار صرف وائسرائے گورنر، کمشنر، فوجی افسر اور راجہ ہی کرتے تھے۔ اس زمانے میں جہاں کہیں کسی شیر کے آدم خور ہونے کی اطلاع ملتی تو وہاں کا ڈپٹی کمشنر اس شیر کے مارنے پر انعام کا اعلان کر دیتا اور کوئی انگریز فوجی افسر کسی مجھے ہوئے ہندوستانی شکاری کے ساتھ وہاں پہنچ جاتا۔ چان باندھا جاتا، بھینس کا کٹا یا بڑا بکرا چان کے ساتھ باندھ دیا جاتا اور کوئی جی دار گاؤں والا ”گاوا“ کے ساتھ شام کو بیٹھا رہتا تا کہ شیر اس کی آواز اور بو پر جلد آئے۔ شکاری چان پر چڑھ بیٹھتے اور گاؤں کا آدمی بھی ان کے ساتھ شروع رات ہی میں درخت پر چڑھ جاتا جو بھی شیر ”گاوا“ پر آتا، شکاری بندوقوں اور رائفل کی گولیوں سے اسے مار گراتے لیکن اکثر ایسا ہوتا کہ آدم خور کی بجائے وہ کسی دوسرے شیر کو مار ڈالتے اور دو چار دن بعد جب آدم خور دس پندرہ میل دور کسی دوسرے انسان کو ہلاک کرتا تو پھر ہا ہا کراٹھ جاتی اور شکاری دوبارہ شیر کا تعاقب کرنے میں لگ جاتے لیکن اب چونکہ شیروں کی تعداد بہت کم ہو گئی ہے، اس لیے جنگلی جانوروں کے تحفظ کا محکمہ پہلے اچھی طرح چھان بین کرتا ہے اور شیر کو زندہ پکڑنے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ اسے کسی چڑیا گھر والوں کو دے دیا جائے۔ اور صرف اس صورت کے ناکام ہونے پر ہی شیر کو ہلاک کیا جاتا ہے۔

نیشنل پارک کے ڈائریکٹر چندر بھان نے درگا پر شاد کی موت کے بعد یہ حکم جاری کیا کہ آئندہ جنگل میں گھاس کاٹنے، پتے توڑنے یا اور کسی کام کے لیے کوئی آدمی اکیلا نہیں جائے گا بلکہ دو تین یا چار کی ٹولیوں میں لوگ جائیں گے۔ اس حکم پر سختی کے ساتھ عمل درآمد بھی شروع ہو گیا۔ 15 فروری 1984ء کی ایک چٹکیلی دو پہر کو علی بہادر اور چرکنا قطب گوشتی اور ایک دوسرے ہاتھی کو لے کر جنگل میں پتے توڑنے کے لیے نکلے تو وہاں ایک چھوٹی سی ندی کے قریب درختوں کا ایک جھنڈ تھا جہاں قطب نے اپنے ہاتھی کے پچھلے پیر میں لوہے کی زنجیر ڈال کر اسے ایک مضبوط درخت کے تنے سے باندھ دیا اور خود قریب کے دوسرے درخت پر چڑھ کر پتوں والی نرم ٹہنیاں کاٹنے لگا۔ علی بہادر جو ابھی تک گوشتی کی گردن پر بیٹھا تھا، نظر اٹھا کر اپنے لیے بھی کوئی درخت تلاش کرنے لگا مگر باقی درخت یا تو چھوٹے تھے یا اور چھدرے۔ اس نے ندی کے پار ایک اور درختوں کے جھنڈ کی طرف دیکھا جو بمشکل دوسو گز دور ہوں گے اور پھر قطب سے کہا کہ وہ پار کے جھنڈ سے پتے کاٹے گا، قطب اس کی واپسی کا انتظار کرے تاکہ دونوں ساتھ ساتھ واپس دھکیلے جائیں۔ گوشتی کو ندی کے پار ایک درخت کے تنے سے باندھ دیا اور خود بڑے سے درخت پر چڑھ کر پتوں والی ٹہنیاں کاٹنی شروع کر دیں۔

جب علی بہادر شیر کے اوپر گر کر تو چند لمحوں کے لیے تو اس کا دماغ ماؤف ہو گیا۔ شیر نے غصے سے غرا کر ایک جھکے سے 130 پونڈ کے علی بہادر کو پانچ فٹ دور پھینکا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ علی بہادر زمین پر گرتے ہی اٹھ کر بھاگ پڑا، مگر شیر نے ایک جست میں اسے گدی سے پکڑ کر جھنجھوڑا

کے نشانوں سے واضح ہو گیا تھا کہ یہ وہی شیر تھا جو درگا پر شاد کو ہڑپ کر چکا تھا۔ گوشتی کے پیر کی زنجیر کھول کر دونوں مہاوت اور گیم وارڈن واپس ہیڈ کوارٹر پہنچے تو سورج غروب ہونے کے قریب تھا۔

علی بہادر تین ماہ تک ہسپتال میں رہنے کے بعد واپس اپنی نوکری پر فائز پارک چلا آیا۔ اب وہ پہلے جیسے بے فکر اور یار باش علی بہادر نہیں رہا تھا۔ موت کو اتنا قریب دیکھ کر اسے مذہب سے زیادہ لگاؤ ہو گیا تھا۔ اب بجائے دوستوں کے ساتھ تاش کھیلنے کے، وہ زیادہ وقت مسجد میں گزارتا۔ اس نے داڑھی بھی رکھ لی اور شیخ وقت کا نمازی بن گیا۔ شیر کو قطب نے خوب اچھی طرح دیکھا تھا، اس لیے فائز پارک کے ڈائریکٹر چندر بھان کے حکم پر ایک پارٹی ترتیب دی گئی جس نے ایک بکرے کو شیر کی کچھار کے قریب ایک درخت کے نیچے باندھ دیا۔ اسی درخت کی اونچی شاخوں پر ایک چھان بنایا گیا جس پر ایک گیم وارڈن اور دو مضبوط جسم والے چرکے ایک بڑا جال اور بھری بندوق لے کر بیٹھ گئے۔ شام کے قریب شیر بکرے کی آواز پر وہاں پہنچ گیا اور جونہی وہ بکرے پر چھنا جال والوں نے جال پھینک کر اسے قابو کر لیا اور لکڑی کے ایک بکس نما بڑے پنجرے میں بند کر دیا۔ آج کل یہ شیر کانپور کے چڑیا گھر میں ہے اور لوگ دور دور سے اسے دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔



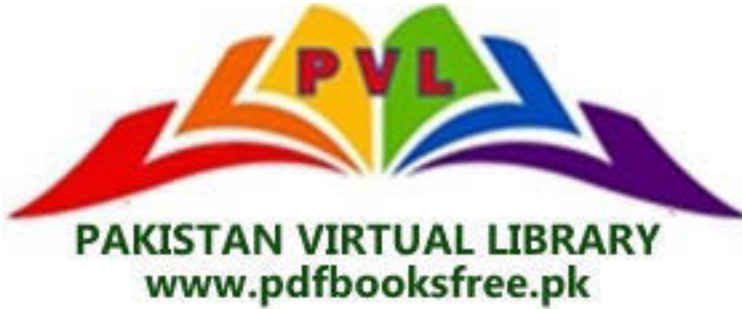
اور ایک قریبی جھاڑی پر اچھال دیا۔ باوجود اس کے کہ جھاڑی کا نٹے والی تھی۔ علی بہادر نے اس کی ایک مضبوط شاخ پکڑ لی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اب شیر اسے منہ میں دبا کر اپنی کچھار میں لے جائے گا، مگر شیر نے ایک ہی جست میں اسے پکڑ لیا اور جھاڑی سے الگ کر دیا۔ اب شیر کا منہ علی بہادر کے جڑے سے صرف ڈیڑھ فٹ کے فاصلے پر تھا۔ بدبو کا ایک زوردار بھکا، اس کے نکتوں سے نکلیا۔ علی بہادر نے گھبرا کر پھر دوڑ لگا دی حالانکہ اس کی گردن سے خون بہہ رہا تھا۔ اس وقت سارے جنگل پر موت کا سناٹا چھایا ہوا تھا اور علی بہادر کے ننگے پیروں کی دھمک دور دور تک سنائی دے رہی تھی۔ ایک لمحہ کے لیے تو شیر حیرت زدہ رہ گیا تھا کیونکہ عجیب شکار تھا جو بار بار اس کی گرفت سے نکل جاتا تھا۔ شیر نے پھر جست لگائی اور علی بہادر کو ناگوں سے پکڑ لیا اور علی بہادر پھر زمین بوس ہو گیا۔ اب صورت حال یوں تھی کہ علی بہادر کی دونوں ٹانگیں شیر کے اگلے پنجوں نے قابو کی ہوئی تھیں اور علی بہادر کولہوں کے بل زمین پر بیٹھا تھا۔ شیر کا منہ علی بہادر کے بہت قریب تھا اور اس کی سرخ آنکھوں جیسی آنکھیں علی بہادر پر مرکوز تھیں۔

زبان باہر نکلی ہوئی تھی اور چاروں نوکیلے دانت صاف دکھائی دے رہے تھے۔ موت کو اتنے قریب دیکھ کر زندہ رہنے کی آرزو علی بہادر کے دل میں پیدا ہوئی اور اس نے ہمت کر کے شیر کی زبان پکڑ لی۔ چند لمحوں کے لیے تو شیر سستہ میں آ گیا مگر دوسرے لمحے شیر کے نوکیلے دانت علی بہادر کی ہتھیلی کے آر پار ہو گئے۔ علی بہادر نے اپنا دایاں ہاتھ جواب بے کار ہو چکا تھا، فوراً کھینچ لیا اور بائیں ہاتھ سے شیر کے منہ پر کلوں کی بارش برسا دی۔ شیر نے غصے اور گھبراہٹ سے اپنا دایاں ہاتھ علی بہادر کے منہ پر مارا جس سے دائیں آنکھ اور دایاں گال نچلے ہونٹ تک ادھر گیا اور خون علی بہادر کی ٹھوڑی سے بہنے لگا۔ علی بہادر نے تکلیف سے ایک زوردار چیخ مار کر اپنا سر نیچا کر لیا اور شیر نے اس کی گدی کو پھراپنے جڑوں میں دبا کر اسے زمین پر گھسیٹنا شروع کر دیا۔ اب علی بہادر کو یقین ہو گیا کہ شیر اسے کسی سایہ دار جگہ لے جا کر چیر پھاڑ ڈالے گا۔ اس نے اپنے گلے کی پوری قوت سے چیخنا شروع کر دیا۔ ”بچاؤ، بچاؤ، شیر نے پکڑ لیا۔“

شیر علی بہادر کو گھسیٹتا ہواندی کی طرف لیے جا رہا تھا اور علی بہادر کی چیخوں نے خاموش فضا میں ایک ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔

ادھر قطب اپنے ہاتھی پر چڑھ کر والی ٹہنیاں لا کر علی بہادر کے واپس آنے کا انتظار کر رہا تھا، جب علی بہادر کی چیخیں اس تک پہنچیں تو قطب نے اپنا ہاتھی چیخوں کی طرف دوڑا دیا۔ چند ہی منٹوں میں وہ شیر کے سر پر جا پہنچا۔ شیر نے گھبرا کر علی بہادر کو چھوڑ دیا۔ قطب نے ہانک لگائی۔ ”علی ہاتھی کے سامنے آ جا۔“ علی بہادر کی دائیں آنکھ بے کار ہو چکی تھی، دایاں ہاتھ کا کام نہیں کر رہا تھا مگر جان اتنی عزیز ہوتی ہے کہ وہ آواز پر دوڑنے کے ہاتھی کے قریب آ گیا اور قطب کی آواز پر ہاتھی نے اسے سوئٹھ میں لپیٹ کر اوپر قطب کی طرف دوڑا دیا جہاں قطب نے اسے تھام لیا پھر قطب نے ہاتھی کو دھکیلی کی طرف دوڑا دیا۔ کچھ دور تو شیر ہاتھی کے ساتھ ساتھ دوڑا مگر مندی پار کرنے کے بعد شیر رک گیا اور قطب زخمی علی بہادر کو جواب بے ہوش ہو گیا تھا، لے کر قصبے کی سرکاری ڈپنسری میں پہنچ گیا۔

خوش قسمتی سے ڈاکٹر نے ابھی ابھی شام کے وقت آنے والے مریضوں کو دیکھنا ہی شروع کیا تھا۔ فوراً ہی علی بہادر کی مرہم پٹی کی گئی۔ اس کی گردن اور منہ پر 32 ٹانگے لگے۔ ڈاکٹر نے بذریعہ جیب بے ہوش علی بہادر کو قریب کے شہر کے ہسپتال میں بھجوا دیا تھا جہاں اس کو تین بوتل خون چڑھایا گیا۔ گیم وارڈن دو مہاتوں کو لے کر دوسری جیب پر واپس جنگل گیا جہاں اس نے علی بہادر اور شیر کی نگہ کش کی جگہ کا جائزہ لیا۔ شیر کے پنجوں



جنگل کا قانون

ریل سے اتر کر شاہ گڑھ اسٹیشن سے ٹھیک شمال کی طرف روانہ ہوں تو پانچ گاؤں چھوڑ کر آخری گاؤں سکھ واس پورا آتا ہے۔ اس کے بعد دو میل سے بھی زیادہ چوڑا میدان پار کر کے لگا ہیں ایک بڑی مالک سیاہ دیوار پرزکشی ہیں جو دائیں ہاتھ پر شار دانہر کی اونچی پڑی سے شروع ہو کر دائیں طرف دھندلی پڑتے پڑتے نظروں سے غائب ہو جاتی ہے۔ دراصل یہ دیوار نہیں ہے بلکہ ترائی کے جنگل کا وہ حصہ ہے جسے مصطفیٰ آباد شیخ کہتے ہیں چونکہ اس جنگل میں چوپایوں کی کثرت ہے۔ اس لیے اس میدان میں گیسوں کی فصل کے سوا اور کوئی کاشت نہیں ہوتی۔ وہ بھی اس طرح کہ کنارے کے تمام گاؤں کے لوگ متفق ہو کر جنگل کے کنارے کیلئے میل کا لہا اور ڈھائی میل کا چوڑا گیہوں کا ایک تختہ خود بچاؤ ہے۔ اتنی بڑی کھیتی میں نقصان ہوتا معلوم نہیں بچاؤ ہو جاتا ہے، ورنہ دراصل یہ دس بارہ میل کا لہا اور ڈھائی میل کا چوڑا گیہوں کا ایک تختہ خود بچاؤ ہے۔ اتنی بڑی کھیتی میں نقصان ہوتا معلوم نہیں ہوتا۔ رات کے آٹھ بجتے ہیں، جگہ جگہ سانہر اور چیتل منہ اونچا کر کے پھیلے ہوئے شاخ دار سینگ پیٹ پر ملا کر تھوٹے بھر راستہ ڈھونڈ لینے کے بعد بے تکلف اندر آ جاتے ہیں۔ ان کے پھیلے ہوئے سینگ کانٹے دار گلیزوں کی دیوار چیر کر ان کے جسم سے زیادہ چوڑا راستہ بنا دیتے ہیں۔ رات بھر چرنے کے بعد دن چوٹنے کی ہلکی روشنی پر یہ جانور پھر اسی طرح واپس نکل کر جنگل میں گھس جاتے ہیں۔

ہولی جلے پانچ دن ہو چکے ہیں۔ رات کے دو بجے ہیں، چاندنی چٹکی ہوئی ہے، کانٹوں کی بازو سے کچھ دو گھنٹوں تک اونچے کھیت میں چھ چیتلیں کھڑی ہوئی اطمینان سے آدھے سوکھے گیہوں کے پتے ایک ایک کر کے بین رہی ہیں۔ کھیت کے کنارے ایک جگہ گیہوں کا دو فٹ کا گچھا اب بھی سبز ہے جیسے کہ اکثر رہ جاتے ہیں۔ اس میں تین اور چیتلیں چٹی ہوئیں ہیں۔ ان کے برابر ہی کھیت سے باہر شاندار جھانک موٹی گردن اینٹھائے پھیلے ہوئے بارہ سینگ تاج کی طرح لگائے خاموش کھڑا کچھ سوچ رہا ہے، ہاتھ، ہیر، سر یا آنکھیں کسی کو بھی جنبش نہیں ہے۔ صرف کان وقتاً فوقتاً ادھر ادھر سے ادھر پھر جاتے ہیں۔ آنکھیں اس قدر تیز نہیں ہیں کہ برابر گھنے جنگل کی تاریکیوں میں پتہ چلا سکیں۔ ہوا بھی مخالف ہے، کھیت سے جنگل کی طرف چل رہی ہے، اس لیے بو بھی نہیں لے سکتا۔ کانوں ہی سے کام لے رہا ہے۔ دور گھنے جنگل میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہلکی گھس گھس ہوتی ہے، دائیں ہاتھ پر کسی جگہ سے بہت خفیف کھٹ کھٹانے کی آواز آرہی ہے۔ ان دونوں آوازوں کی اسے مطلق پروا نہیں ہے۔ یہ صاف پہچان گیا ہے کہ یہ آواز نیو کی کے بچوں کے کھیلنے کی ہے اور دوسری جنگل کی نیلی کھٹ بڑھی کے درخت کی چھال سے کڑے پھٹنے کی ہے۔ جھانک اس گٹر میں ہے کہ ابھی تھوڑی دیر ہوئی، سال کے درختوں میں زمین سے لمبی لمبی سی چیز ہلنے کا جو شبہ سا ہوا تھا، وہ دراصل شیر ہی تھا یا کچھ اور سوکھے پتے کی ہیر کے نیچے چر جانے کی ایک خفیف سی آواز اسے سارا مارا جہ بتا دینے کے لیے کافی ہے۔

لیکن کیا مجال کہ شیر یا شیرنی کا ہیر بے جا پڑ جائے۔ حالانکہ سال کی تمام زمین پت جھڑ کے پتوں سے بھٹی پڑی ہے لیکن یہ دونوں ایک

بھی پتا چڑھائے یا کھس کھسائے بغیر یہاں آ کر دیمک کی بنائی ہوئی چھوٹی سی دیوار کی آڑ میں اسی گھل کی واپسی کے انتظار میں بیٹھ گئے ہیں۔ ان کے اور چیتلیوں کے درمیان بحث کے چوڑے پتوں اور مروڑ پھلی کی لمبی شاخوں سے اس قدر آڑ ہو گئی کہ نظر ان دونوں کو بھی کچھ نہیں آ رہا ہے پھر بھی دونوں اطمینان سے دیکھے بیٹھے ہیں۔ تیز ہوا میں جو کھیت سے جنگل کی طرف چل رہی ہے۔ چیتلیوں کی دیوار ان کے ہلنے چلنے کی آوازیں آرہی ہیں۔ دفعہ شیرنی کو ہوا میں ایک نئی بو معلوم ہوتی ہے، وہ گھبرا کر شیر کی طرف سرگھماتی ہے۔ شیر نے کوئی بو محسوس نہیں کی۔ وہ اسی طرح بیٹھا رہتا ہے۔ اتنے میں پھر تیز ہوا کا جھونکا آتا ہے، اب شیر کو بھی یہ نئی بو معلوم ہو جاتی ہے۔ شیر جھنجھلا کر دونوں کان آگے جھکاتا ہے لیکن شیرنی پریشان ہو کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ ہوا کا ایک جھونکا پھر آتا ہے، اب شے کی گنجائش نہیں رہتی۔ دونوں اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں، پھر آہستہ سے گھوم کر شمال سے مشرق کی طرف چل دیتے ہیں۔

باہر کھیت میں جھانک اب بھی اسی طرح کھڑا ہے، سبز گچھے پر اب تین کے بجائے پانچ چیتلیں بھدک رہی ہیں، باقی چار انہیں سوکھے گیہوں میں سے پتے کھا رہی ہیں۔ چرتے چرتے ان چاروں کو بھی بو معلوم ہوتی ہے۔ ایک ایک کر کے چاروں سراونچا کر کے کھڑی ہو جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک جھانک کی طرف دیکھتی ہے۔ جھانک جنگل کی طرف کان لگائے، اسی طرح بے خبر کھڑا تھا۔ ایک چیتل کو دور سکھ واس پور کی سمت دھندلی سی ہلتی ہوئی کوئی چیز معلوم ہوتی ہے۔

چیتل فوراً کوئی لمبی آواز لگاتی ہے۔ سنان رات میں جنگل کے کنارے سے آواز گونجتی ہے۔ باقی تمام چیتلیں چونک کر سراونچے کر کے کھڑی ہو جاتی ہیں۔ جھانک بھی گھوم پڑتا ہے۔ یہ تمام جانور پانچ منٹ تک چتر کی موتیوں کی طرح بے حس کھڑے رہتے ہیں، بو برابر آرہی ہے لیکن دور ہلنے والی چیز رک گئی ہے۔ پانچ منٹ بعد وہ چیز پھر ہلتی ہے، سب چیتل ایک ساتھ جنگل کی طرف جھپٹے ہیں۔ کانٹوں کی بازو جا بجا ٹوٹی ہوئی ہے۔ چیتل انہیں میں سے ایک راستے سے ایک کے بعد ایک تلا نہیں بھرتے نکلے ہیں۔

سب سے آخر میں جھانک بھی اس قطار میں شامل ہو جاتا ہے جو چیتلوں نے بنائی ہے۔ جنگل میں گھٹے گھٹے وہی چیتل پھر دفعہ کو کوئی آواز لگاتی ہے اور سب چیتل جنگل میں غائب ہو جاتے ہیں۔ سامنے کچھ دور سوکھے گیہوں میں ایک پریشان انسان کھڑا ہے۔

☆☆☆

پھانسی کے تختے پر بے کسی اور بے بسی کی موت سے بچنے کے لیے بھاری گاؤں سے بچتا ہوا شاہ گڑھ اسٹیشن سے دیوانہ وار اس جنگل کی طرف آیا تھا۔ اس کے خیال میں گھنے سرسبز جنگل، پھولوں پھلوں سے لدے، چھوٹے چھوٹے چشموں سے آراستہ دامن پھیلائے، اسے اپنی گہرائیوں میں چھپانے کے لیے تیار کھڑے تھے، لیکن جنگل کے کنارے آتے ہی اس پر اس سمت سے بھی خوف طاری ہو گیا۔ اس کی پشت پر گاؤں کی اکا دکا ٹھناتی روشنیاں ملک الموت کی آنکھیں معلوم ہو رہی تھیں۔ اس کے سامنے وہ جنگل تہر کی طرح تاریک اور ہمایا تک معلوم ہو رہا تھا جسے زندگی کا گہوارہ سمجھ کر وہ اس کا جو یا ہوا تھا۔ آنکھوں سے اس نے کچھ نہیں دیکھا۔ نہ ناک سے کوئی بو محسوس کی تھی، صرف چیتل کی کوکبیں سی تھیں اور انہیں تین آوازوں نے اس کی خیالی جنت ایک ہیبت ناک گھنا بن بنا دی تھی۔

بہاری دیہات کا رہنے والا ضرور تھا، بھوت پریت سے ڈرنا جانتا ہی نہیں تھا لیکن جنگل سے ناواقف تھا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا، وہ سر پکڑ کر وہیں کھیت میں بیٹھ گیا۔ اپنی بے کسی پر اس کی آنکھوں سے خود بخود آنسو بہنے لگے۔ اس کے دماغ میں خیالات کا ایک ایسا پہچان تھا کہ وہ کوئی ایک بات لگا تار سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ کبھی وہ اپنی بد قسمتی کا خیال کرتا تھا، کبھی بے بس بوزھے باپ اور ماں کی حالت سوچتا تھا، کبھی اپنی موجودہ حالت پر نظر ڈالتا تھا اور کبھی آئندہ زندگی بسر کرنے کا نقشہ کھینچتا چاہتا تھا لیکن ہر پھر کے ہر خیال میں کسی نہ کسی طرح ایک تصویر آ جاتی تھی۔

چاندنی رات میں ایک کھیت کی مینڈھ ہے، اس پر ایک آدمی خون میں نہایا، اونڈھا پڑا ہے۔ اس کے پیروں کی طرف وہ خود گنڈا سا لیے کھڑا ہے۔ اس تصویر سے بہاری لرز جاتا ہے، کانپ اٹھتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کے متعلق نہ سوچے مگر بار بار اسے یہی خیال آ جاتا تھا۔ وہ بار بار کہتا تھا، میں بلد یو سنگھ کا قاتل ہوں تو کسی لیکن ہے رام یہ کیسے ہوا؟ کیسے ہوا؟ ہاں میں نے مارا۔ دو گنڈا سے سر پر ہلکے سے مارے تھے اور تیسرا ہی زور سے مارا جو پیٹھ میں گھس گیا، اسی سے تو گر پڑا۔ پیٹھ کا زخم؟ نہیں پیٹھ والے سے کیا ہوا؟ وہ تو پہلا ہی گنڈا سا سر میں گھس گیا، میں نے مارا؟ یہ کیا ہو گیا تھا؟ رام یہ کیا ہو گیا؟ ہے بھگوان! اب وہ زندہ ہو سکتا ہے؟ تائیں ناہیں! ہے بھگوان؟ معافی مل سکتی ہے؟ تائیں! ناہیں!

اسی طرح سوچتے سوچتے ٹھنڈی ہوائے تھکے ہوئے دماغ میں نیند کے ہلکے ہلکے پردوں میں ملا کر ایک عجیب تصویر پیش کر دی۔ کیا دیکھتا ہے کہ بلد یو سنگھ کا باپ اس کے سامنے لڑکے کو لے کھڑا ہے اور اس سے کہہ رہا ہے۔ کنور بھیا یو ہے بہاری تیرے سامنے! اب ماپھہ کر دیو اچھے ہوئی جانی ہو بلد یو سنگھ کے منہ سے خون بہہ رہا ہے۔ وہ آنکھیں بند کیے سامنے کھڑا ہے اور برابر کہہ رہا ہے ”بس کنور اب جان دیو، ماپھہ کر یو۔ اچھے ہوئی جاؤ پھر بڑھا اس کی طرف غصے سے دیکھ کر کہتا ہے۔ ”بہاری! تم بھی ماپھی مانگ لیو پیٹھے کا دیکھ رہے ہو، مانگو ماپھی۔“ بہاری! ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتا ہے۔ بلد یو سنگھ سر ہلا کر باپ سے کہتا ہے، معاف نہیں کروں گا!“۔ اب بہاری اس کے پیروں پر گر پڑتا ہے۔ اس پر وہ کہتا ہے، میں نا معاف کروں گا، بلاؤ سپاہیوں کو۔“ پکڑو پکڑو دوڑ دوڑو اسے پکڑو۔“ بہاری کی آنکھ کھل جاتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیسیوں آدمی دوڑے چلے آ رہے ہیں، وہ چونک کر جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

صبح کی سہانی روشنی اسے بھیا تک معلوم ہوئی، شہر اُتر دیگہوں کا کھیت موت کے ہاتھ سے مٹایا ہوا نظارہ معلوم ہوا۔ کالا جنگل کا کنارہ ایک قلعہ معلوم ہوا جس میں اسے موت سے چناہل سکتی تھی۔ وہ فوراً اس کی طرف لپکا، لیکن چار قدم چلنے کے بعد اس نے گھوم کر پیچھے دیکھا کہ کوئی اس کا تعاقب تو نہیں کر رہا ہے؟ درختوں سے جھانکتے ہوئے سکھ داس پور کے مکانات پر اس کی نگاہ پڑی، ہر مکان اسے مشتبہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ بہاری جنگل کی طرف بھاگا اور کانٹوں دار باڑھ چھانڈتا ہوا، جنگل میں غائب گیا۔

☆☆☆

جس وقت دوبارہ مرنے نے اذان دی تو بہاری نے آنکھیں کھول دیں۔ صبح کا ہلکا سا نور پھیل رہا تھا۔ قریب ہی کسی درخت پر کوئی مور رات بھر کے سنے ہوئے پر پھر پھرا رہا تھا۔ اس کے سر کی طرف اوپر کی کسی ڈالی پر ایک چھوٹی سی چڑیا چیں چوں چیں چوں چپک رہی تھی۔ لمحہ بہ لمحہ روشنی کے ساتھ چڑیوں کے چھپانے کی آوازیں بڑھ رہی تھیں۔ بہاری نے دن بھر کے سڑے ہوئے ہاتھ پیروں کو جنم دے دیا اور محسوس کیا کہ جوڑ جوڑ

میں درد ہو رہا ہے۔ وہ ”اے بھگوان کر پا کر بھگوان“ کہہ کر بیٹھ گیا اور اطمینان سے وہ ری کھولی جس سے اس نے اپنا سینہ اور گردن کر گرد کے دو شانے سے باندھ رکھی تھی تاکہ وہ سوتے میں درخت سے نہ گر پڑے۔ بہاری کو آج جنگل میں آئے آٹھ دن ہو چکے ہیں۔ یہیں اس نے مروڑ پھلی کی چھال سے یہ ری بٹ لی ہے۔ رات کو کھیت سے گہیوں کی بالیاں توڑ کر ہولوں کی طرح بھون کر کھا لیتا ہے، پھر جنگل کے کنارے ہی کسی موٹے درخت پر چڑھ کر اس کی ڈالیوں میں اپنے آپ کو باندھ کر سو رہتا ہے۔

دن نکلنے ہی پھر اندر گئے جنگل میں گھس کر جنگل سے گھری ہوئی چادر میں چھپ جاتا ہے۔ جنگل کا جو تصور اس نے باندھا تھا، یہاں آ کر اس میں سے کچھ نہ پایا۔ سال بنی جنگل دراصل ایک میدان کی طرح تھا جس میں فٹ سوائف اونچے بھنار اور کیری کے چھوٹے پودوں میں لاکھوں سال کے درختوں کے سیدھے اور ہلکے بے شاخوں کے تنے کھڑے ہوئے پچاس ساٹھ فٹ کے اوپر پھرتی نما چند ڈالیوں سے ایک چھت تھا سے ہوئے تھے۔ رات کو ان درختوں پر چڑھ رہا اور دن میں ان کے نیچے زمین پر پھرتا ناممکن تھا۔

آٹھ نو بجتے ہی جنگل میں گائے اور بھینسوں کے گلے اور چرواہے آ جاتے ہیں۔ مزروعہ زمین کی طرف جنگل کے کنارے البتہ نیچے اور پھیلی ہوئی ڈالیوں کے درخت بھی تھے۔ گھنی جھاڑیوں کے مجموعے سے بنی ہوئی چھوٹی بڑی بھجیاں بھی تھوڑی تھوڑی دور پر تھیں لیکن دن کے وقت ان کا چھپنا ناممکن اور کسی طرح ٹھیک نہیں تھا۔ سال بنی شمال کی طرف میلوں اسی طرح چلی گئی تھی۔ اس کے شرق میں شاردانہر کی شاخ ہر دوئی براؤنچ بہہ رہی تھی اور مغرب کی طرف ناقابل گزر کھیر کے جنگل سے ملا ایک چاند تھا۔ اسی چاند کے بیچ میں ایک چھوٹا سا تالاب یا گنڈھا تھا جس کے کنارے دلہل یا کچڑ میں بیٹھ کے اور کھڑے رہ کر بہاری دن گزارتا تھا۔ نیچے کچڑ میں جو کس ہاتھ پیر اور پیٹھ پر ڈانس اور آنکھ کے آگے صدمہ ہاتھکے اسے ستاتے تھے۔ جنگل کا چاند صدمہ ہاتھکے سینوں پتاروں اور گھاسوں کا ایک ایسا اونچا اور گھٹا نکڑا ہوتا ہے جس میں انسان کو پورا پیر رکھنا محال ہوتا ہے۔ چاند میں کبھی کوئی ایسا قدر آور درخت نہیں ہوتا جس پر انسان چھ سات فٹ بھی اوپر چڑھ سکے۔ اگر کوئی یہ چاہے کہ چاند کی ٹیٹھرے نما گھاس کچل کر دوفٹ جگہ بنالے تو یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ وہ اس قدر سخت ہوتی ہیں کہ کسی مضبوط ہتھیار کے بغیر نہیں کٹ سکتیں۔ پھر اب موسم بھی اور ہے، ہولی جل چکی ہے۔ سبز لہلہاتے چاند کو چار مہینے کی سخت سردی نے مار کر سکھا دیا ہے۔ یہاں نہاب چڑیاں چھپاتی ہیں، نہ کالا تیز بولتا ہے، کھڑکھڑاتا ہوا بھورا چاند ایک چنگاری کا خطر ہے جو کسی نہ کسی طرح ہر چاند میں پہنچ کر ان مردہ گھاسوں کو فنا کی آخری منزل میں پہنچا دیتی ہے اور جب چاند محل کر بھوری اور سیاہ را کھ سے ڈھکا ہوا نکل آتا ہے تو اس آتش کی خاک سے آنے والی نسل کے بے خبر نو نبال پودے ہستے ہوئے سر نکالتے ہیں۔ ظالم ظالم قدرت کے قوانین ظالم ہیں۔

بہاری بڑی دیر تک ہاتھ میں ری لیے، دوسرے ہاتھ کی انگلی سے برگد کی چھال کریدتا ہوا اسی ڈگالے پر بیٹھا سوچتا رہا، وہ جنگل کی اس زندگی سے اتنا عاجز آچکا تھا کہ اب اس بات پر بالکل آمادہ تھا کہ پاس کے گاؤں میں جا کر فقیر یا سادھو کے بھیس میں قسمت آزمائے۔ اگر پکڑا بھی گیا تو پھانسی پر بھی لٹکا پڑا تو اسے گوارا تھا لیکن وہ ٹکھفیں جواب وہ اٹھا رہا تھا، ناقابل برداشت معلوم ہو رہی تھیں۔ اس کے پاس ماچس کے ایک کبس اور چند بے کار روپوں کے سوا اور کوئی چیز نہیں تھی۔ کاش ایک چاقوی ہوتا، دیاسلانی بھی ختم ہونے کے قریب آچکی تھیں۔ دیاسلانی کا خیال آتے ہی اس نے پھٹے ہوئے کوٹ کی جیب سے ماچس کا کبس نکال کر اس کی تیلیاں گھسنے کے بعد نہایت احتیاط سے پھر اسے جیب میں رکھ کر ”بھگوان“! دیا کر

بھگوان! کہتے ہوئے درخت سے نیچے اترنا شروع کیا جب آخری شے پر آگیا تو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اس میں لٹک گیا۔ اس کے پیراب بھی زمین سے چار فٹ اونچے ہوں گے کہ اس نے دونوں ہاتھ چھوڑ دیئے اور دم سے زمین پر آ رہا۔ سنبھل نہ سکا، ہاتھ زمین پر ٹیک کر بیٹھ گیا۔ ساتھ ہی اس کے دائیں ہاتھ کی طرف ساٹھ فٹ کے فاصلے پر ایک عورت کی ”ارے دیا“ چلانے کی آواز آئی، سرگما کر دیکھا تو ایک عورت رفع حاجت کرنے سے لٹایا ڈینا چھوڑ کر بھاگی چلی جا رہی ہے۔

بہاری بھی گھبرا کر اٹھا، جنگل کے اندر کی طرف بھاگا، مگر فوراً لٹیا کا خیال آیا۔ بھاگتا ہوا اس تک گیا، اسے اٹھا کر ہاتھ کا کپڑے کی بڑی سی ایک پوٹلی اور نظر آئی، اس نے اسے بھی اٹھا لیا اور لٹیا کا پانی گراتا ہوا عورت سے دوسری سمت بھاگا، فاقوں اور مصیبتوں سے جسم لاغر ہو رہا تھا۔ تھوڑی ہی دور میں سانس پھول گیا۔ بھاگتا بند کر دیا، تیز قدم اٹھاتا اسی چاند میں گھس گیا۔

☆☆☆

چاند میں پہنچ کر بہاری نے پوٹلی کھولی تو اس میں سے ایک کھرنی، ایک بنیا، چھٹا تک بھر کے قریب تمباکو، چلم، ایک دیا سلائی کی ڈبیا اور کوئی سوا سیر کی روٹی اور بیٹن کی بھائی نکلے۔ بہاری نے فوراً کھرنی اور بنیا کی مدد سے چاند میں ایک خشک جگہ تھوڑی سی زمین صاف کی، اس کے بعد لٹیا میں پانی بھر کر لایا۔ آٹھ دن ہو چکے تھے۔ سیر ہو کر روٹی کھائی، پھر آگ جلا کر چلم بھری اور اطمینان سے چیتا رہا۔ عرصے بعد یہ نعتیں ملی تھیں۔ روٹی اور تمباکو دونوں کا نقشہ چڑھا دیں پڑ کر سو گیا۔ دن کے دس بجے سو یا، شام کے چار بجے اٹھا، درخت پر نیند کہاں بھرتی تھی۔ اب جو سو کر اٹھا تو خواہ مخواہ طبیعت پر ایک طرح بٹاشی تھی۔ صبح ہر اسان ہو کر وہ گاؤں میں جانے کے لیے بالکل تیار ہو گیا تھا، لیکن اب اس کے خیالات بدل گئے۔ زندگی کا چسکا پھر زندہ ہو گیا۔ ہنسا دیکھ کر وہ فوراً سمجھ گیا کہ گیسہوں کی کٹائی شروع ہو گئی ہے۔ اس وقت اسے یہ فکر تھی کہ جلد سے جلد جس قدر گیسہوں کھیتوں سے کاٹ سکتا ہو، کاٹ کر جنگل ہی میں کہیں چھپا دے، ورنہ گیسہوں نہ رہیں گے تو کیا کھائے گا۔ آبادی میں واپس جانے کو اب اس کی ہمت نہیں پڑتی تھی، اسے یقین تھا کہ وہ انسانوں میں گیا نہیں کہ پکڑا گیا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ جہاں تک ہو سکے فی الحال تو جنگل میں چھپا رہے۔ دنوں بعد پیٹ بھر روٹی نے اس میں ایک نئی روح ڈال دی تھی۔

شام ہوتے ہی وہ آئندہ کے منصوبے کا غصتا ہوا چاند سے نکل کر جنگل کی سو فی سڑک کے کنارے آہستہ آہستہ آ رہا تھا کہ اس کے بائیں ہاتھ کی طرف سڑک کے دوسرے کنارے پر اس کی نگاہ پڑی، کیا دیکھتا ہے کہ سامنے سے شیر چلا آ رہا ہے، سر سے پیر تک پسینہ آ گیا۔ بت بن کر جہاں کا تھاں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ بہاری کو یقین سا ہو چکا تھا کہ اس جنگل میں شیر اسے دو دفعہ پہلے دیکھ چکا تھا اور آج تیسری دفعہ آتنا سامنا ہی ہو گیا۔ شیر نے اسے دیکھ کر اپنا بہاری شاہانہ چہرہ ٹھنکتے سے پیچھے پھیر کر ایک لمحے کے لیے کچھ دیکھا پھر نہایت شان اور اطمینان کے ساتھ اس کی طرف دیکھتا ہوا بالکل آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔ بہاری سکتے کے عالم میں کھڑا دیکھتا رہا کہ شیر کے پیچھے ایک اور شیر تیز قدم آ رہا تھا، یہ شیر نئی تھی۔

پورے دن پیٹ سے ہونے کی وجہ سے اس کی طبیعت چڑچڑی ہو گئی تھی جیسے ہی شیر کے قریب آئی، اس کی نگاہ بہاری پر پڑی، ہلکی سی غراہٹ اس کے منہ سے نکلی، شیر اور آہستہ ہو گیا۔ جونہی شیر نے اس کے بائیں ہاتھ کی طرف برابر آئی شیر یاس کے جنگل کی طرف گھوم پڑا اور اس طرح

ناراض شیر نے کو اپنے پہلو سے دھکیلتا ہوا ہٹا لے گیا۔ بہاری کے اس قدر اوسان خطا ہو گئے تھے کہ شیر اور شیرنی کے جنگل میں غائب ہو جانے کے بعد بھی وہ وہیں کھڑا تھا، عقل کام نہیں کرتی تھی کہ کدھر جائے، کیا کرے؟۔ آخر پھر روانہ ہوا، تھوڑی ہی دور گیا ہو گا کہ اس کی پشت سے مور چلایا۔ مڑ کر دیکھا تو وہ دونوں شیر اس سے کتر کر کچھ دور جنگل کے اندر اندر چل کر پھر سڑک پر نکل آئے تھے اور اس طرح اسے چھوڑ کر جا رہے تھے۔ بہاری کی متواتر جنگل میں موجودگی سے غصہ دونوں ہی کو آ رہا تھا مگر شیر سمجھ دار مطمئن طبیعت کا تھا، اس نے دیکھا کہ معاملات نازک ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کی ملکہ پیٹ سے ہے، تنہائی کی سخت ضرورت ہے، یہاں یہ انسان ہر وقت موجود رہتا ہے۔

دوسرے اس کی موجودگی سے دس بیس کا ٹکرا اور پاڑے جو اس کڑے میں مستقل طریقے سے رہتے تھے، کوچ کر گئے ہیں اور نہ صرف یہی بلکہ چھتیل اور سانجھروں کی ٹولیوں نے بھی ادھر آنا بند کر دیا ہے۔ غذا کی کمی ہوتی جاتی ہے، بہتر ہے کہ یہ ٹکڑا چھوڑ کر چوکا ڈھایا کے زنگوں میں رہا جائے، چنانچہ شیرنی کو لیے لکلا چلا گیا۔ چار میل کی معمولی چہل قدمی کے بعد دونوں سارہ کی اصل نہر کینال پر پہنچ گئے۔ سامنے چوکا ڈھایا کا بل تھا مگر انہیں اس کی ضرورت نہ تھی۔ اس سے دو قدم ادھر ہی نہر میں انہوں نے پانی پیا اور پھر تیرتے ہوئے پار نکل گئے۔

☆☆☆

رات گئے تک بہاری گیسہوں میں لگا رہا تھا، صبح صوب نکل آئی تھی، اس کی آنکھ کھلی، اس نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا، دور کھیت میں تین چار لال صافے دیکھ کر اس کی روح خشک ہو گئی۔ جلدی سے وہی کھول کر درخت سے نیچے اتر آ۔ درخت کی جڑ میں چاروں طرف بن کر دندوں کی گھنٹی جھاڑیوں نے اور اس پر پھیلی ہوئی بیلوں نے پوری آؤڑ رکھی تھی۔ یہ وہیں سمٹ کر بیٹھ گیا، ڈر کے مارے سانس بھی پوری طرح نہ لیتا تھا، دل کی دھڑکن سے محو تھا جس کی آواز اسے فقارے کی چونوں کی طرح معلوم ہو رہی تھی اور جب سپاہیوں اور آدمیوں کے پیروں کی آہٹ اسی کی طرف بڑھتی سنائی دینے لگی تو اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے کہا ”ہے رام ایک میں اور سارا جگ میرا دشمن؟ مجھ سے کیا خطا ہو گئی ہے۔ میں نے کس جنم میں کنووں پاپ کیے تھے“۔ اس کے تصور نے چاندنی رات کا وہ نقشہ پھر اس کے سامنے کر دیا جب کہ اس کا گڈا سا بلی دفعہ بلد یونٹک کے سر میں کھسکنا ہوا گھٹا چلا گیا تھا۔ اس کے سیدھے ہاتھ کو تیز دھار گندہ ہڈی میں گھسنے کا احساس ہونے لگا۔ بہاری نے پھریری لے کر وہ خیال مٹا دیا اور نہ معلوم کیوں اور کس لیے وہ اپنے آپ ہی سے جھٹ کرنے لگا۔

”میں مجرم ضرور ہوں لیکن سزا کا مستحق نہیں ہوں۔ میں ہرگز ایسا نہ کرتا، اگر میرے دوستوں نے مجھے شراب نہ پلا دی ہوتی اور اگر بلد یونٹک کے باپ نے میرے اوپر اس قدر ظلم نہ کیے ہوتے۔ بے دخل کیا، زمین چھینی، باغ چھینا لیکن اس کا بدلہ بڑے کو مار ڈالنا؟ قتل، قتل، قتل؟ ہاں قتل! میں نشے میں تھا۔ پھر اسی حالت میں رضائی نے آکر جوش دلایا۔ جتنا میری ٹھگیت رہے۔ میری ٹھگیت رہے، اس کے گھر میں بھی تو بلد یونٹک جتنا! جتنا! اب کس کی ہے؟ ہے رام کر پا کر“۔ بالکل قریب آدمیوں کے باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ لوگ اسی طرف آ رہے تھے۔ ”بڑے داروغہ! خان کی آواز آئی۔“ پاگل ہوئے ہو کہیں ڈاکو کھیت کاٹنے ہیں؟ گیسہوں چراتے ہیں؟ ڈاکو ہوتا ہے تو کہیں نہ کہیں واردات ضرور کرتا“ ایک آواز۔ ”سرکار اکیلا ہی لگتا ہے۔“

داروغہ جی۔ ”اے لوکی دم یہ ہم بھی جانتے ہیں، یہاں تو عیروں کے نشان دیکھنا چاہتے ہیں اور چاند میں جا کر کیا چھ آدمی ڈھونڈ لیں گے؟ پانچ سو آدمی بھی ہوں تو نہیں ڈھونڈ سکتے ہیں۔ یہ تو گاؤں ہی میں پکڑا جائے گا، تھوڑے دن میں گھبرا کر ضرور کسی نہ کسی گاؤں میں جائے گا۔ تم لوگ خیال رکھنا۔ جو پکڑ لائے گا یا اطلاع دے گا، اسے بہت انعام ملے گا۔“

☆☆☆

دنیا بھر سے زیادہ پیاری جان۔ تیری حفاظت ہر طرح کی جاتی ہے۔ سڑک کے کنارے اندھی لنگڑی بڑھیا سسک سسک کر بھیک مانگتی ہے۔ جوانی کے وہ دن! عشاق کے جھوم، عیش و عشرت، روپیہ پیسہ، بال بچے، گھر بار، سب رخصت ہو گئے۔ کچھ نہ رہا۔

الوداع! اے انسانو! بستیو! الوداع! بہاری اب کبھی تمہاری طرف رخ نہیں کرے گا۔

انسانی رہ گزرے کوسوں دور گھنی سبز اور شاداب جھاڑیوں اور طرح طرح کے فرتوں سے ڈھکا چوکا ڈھایا ڈھلوان اترتا ہوا اپنے میں ٹھنڈی سبز بید کی جھاڑیاں شامل کر لیتا ہے تو پھر وہاں انتہائی گھنا پندہ فٹ اونچا نرکل کا تختہ اس سے آملتا ہے، جب تمام جنگل سوکھ جاتا ہے اور ہر طرف آگ لگی ہوتی ہیں تو یہاں مہکتے ہوئے پھولوں میں صد ہا چڑیاں جھولا جھولتی ہیں اور قدرت کے راگ گاتی ہیں۔ اسی نرکل میں ایک جگہ سے چھپا ہندی چھپچھاندی بو آتی ہے۔ تر زمین پر نازک نرکل بچھا کر شیر اور شیرنی نے بچے دیئے ہیں جنہیں وہ لپٹی ہوئی بڑے غرور سے دیکھ رہی ہے۔ اس کی پشت پر شیر غافل پڑا سو رہا ہے، بچوں کی آنکھیں کھل چکی ہیں، وہ آہیں میں کھیل رہے ہیں۔ سہرے بدن پر ہلکی دھاریاں بھی نظر آنے لگی ہیں، شام ہو گئی ہے۔ شیرنی کو انتظار ہے کہ کب اس کا سرتاج شیر اٹھے اور کب وہ ڈھائے سے اوپر سانپ لائن سے کچھ دور روہنی کی جھاڑیوں میں جائے جہاں کل کا بچا ہوا آدھا سانپ اب بھی پڑا ہے۔ شیر انگڑائی لے کر لیٹے سے سر اٹھا کر اسے اور بچوں کو دیکھتا ہے۔ شیرنی فوراً بدن کو جھکول دے کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ گول منول بھورے بھورے دونوں بچے جو اس کے اوپر سواریاں ایک دوسرے پر داؤ لگا رہے ہیں۔ لہ لہ زمین پر گر کر لڑھک جاتے ہیں جیسے شیر اٹھ کر بیٹھتا ہے، شیرنی نرکلوں میں آمدورفت سے بنی ہوئی گلی کا رخ کرتی ہے، شیرنی چونکہ دودھ پلا رہی ہے، اس کی اشتہا بڑھی ہوئی ہے وہ بھوکی ہو رہی ہے، آخر شیر بھی روانہ ہو گیا جب نرکلوں سے باہر آ گیا تو اس نے ایک لمبی چوڑی انگڑائی پھری اور شیرنی کے پیچھے پیچھے اطمینان سے چل دیا۔

بید کی جھاڑیوں سے نکل کر جیسے وہ دونوں سانپ لائن پر آئے، ایک سا کھوکی سا ٹھنڈے فٹ کی بلندی سے مور نے می اوں کی نعرے لگائے، بلدو کے درخت پر بیسیوں بندروں کی کلنگی بندھ گئی۔ ان دونوں کو آج شکار تو مارنا نہیں تھا، اس لیے چھپ کر پھرنے کی ضرورت نہیں تھی، ان کے نکلنے کی اگر جنگل کو اطلاع ہو گئی تو ہو جائے اطمینان سے کھلم کھلا سانپ لائن پر چلتے رہے اور جب روہنی کے جنگل کے نیچے پہنچ گئے تو باری باری ایک جست لگا کر ڈھائے پر چڑھ گئے اور روہنی میں تھوڑی دور چل کر سانپھری کی بچی کھچی ٹھٹھری پر پہنچے لیکن یہاں آتے ہی دونوں کے شانہ سکوت اور اطمینان میں قہر اور غصے کا تغیر پیدا ہو گیا۔ شیر غضب ناک ہونے لگا، اس کی نرم و نازک لچکتی ہوئی ملکہ خون خوار جھجھلاتی ہوئی شیرنی ہو گئی، گوشت چرایا گیا ہے، انسان کی بو آ رہی ہے۔ شیر کی سیدھی دم کی نوک دائیں اور بائیں لہرا لہر کر طبیعت کا انتشار ظاہر کرنے لگی، شیرنی کو غصہ زیادہ تھا، ناگن کی سی دو پھنکاروں کی سی آوازیں اس کے منہ سے نکلیں وہ سانپھری کی بچی ہوئی کھال اور ہڈیاں سوٹھتی ہوئی اس کے چاروں طرف گھومی پھر ایک طرف روانہ

☆☆☆

ہو گئی۔ آج وہ ضرور اس موذی چور سے بدلہ لے گی یہ تیسری بار ہے کہ اس کا شکار چوری ہوا ہے۔ شیر بھی اس کے ساتھ ساتھ روانہ ہو گیا لیکن اب اس پر وہی فطری ستانت آگئی تھی، وہ بڑھ کر شیرنی کے آگے ہو گیا۔ جاتے جاتے تین فرلانگ بعد جیسے ہی کنارے کی گھنی پتادور سے کھلی ہوئی فائر لائن پر شیر نے باہر کوسر نکالا، دوسو قدم پر بھاگتا ہوا انسان نظر آیا۔ شیر آہستہ سے ایک قدم پیچھے ہٹ کر اپنے سیدھے ہاتھ کی طرف گھوم پڑا اور اسی طرف کھتا ہوا شیرنی کو نہر کی مٹوی پر نکال لے گیا۔

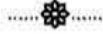
اگر کوئی چیز انسانی دماغ پر ایک ہی وقت میں دو متضاد اثرات پیدا کر سکتی ہے تو ترائی کے جنگل ہیں..... جنہوں نے خود ان جنگلوں کی سیر نہیں کی ہے، وہ مشکل ہی سے سمجھ سکتے ہیں۔ شام کے وقت چوکا ندی کے ڈھائے کے کنارے کسی فائر لائن پر کھڑے ہوں، تو دونوں طرف کے اونچے سال کے جنگلوں میں لاکھوں قدم آور درختوں کے تنے ہی اوپر کے سبز پتوں سے بنی ہوئی چھت کے اندھیرے میں نگاہ سے اوجھل پڑتے پڑتے غائب ہو جاتے ہیں۔ ڈھائے کی طرف صد ہا جھاڑیاں ان پر نیلیں اور دھانی رنگ کے نازک پودوں کے بعد ہر کچی بید کی نیلوں سے بنی ہوئی جھاڑیوں سے ہوتی ہوئی نگاہ نکل کے لہلہاتے تختے پر نیلوں جا کر دھندلی پڑتے پڑتے کسی دور دراز جنگل میں مل جاتی ہے جو قاصد کی وجہ سے دھندلے غبار کی طرح دکھائی دیتا ہے۔

جنگل میں ہر طرف خاموشی ہی خاموشی ہوتی ہے، دفعۃً ایک مرغی لڑکراتی ہے اور اس کے بعد ہی مور چلاتا ہے، می آؤں، می آؤں اور پھر خاموشی چھا جاتی ہے۔ منظر ایک ہی وقت میں انتہائی دل فریب بھی معلوم ہوتا ہے اور انتہائی بھیاںک بھی۔ انسان خوف زدہ ہو کر یہاں سے بھاگتا بھی چاہتا ہے اور بٹنے کو دل بھی نہیں چاہتا لیکن یہ سب کچھ اسی وقت تک ہے جب تک دن کی روشنی پوری طرح موجود ہے جیسے اندھیرا بڑھتا ہے، اس کی دل فریبی بھیاںک پن میں بدلتی جاتی ہے، جوں جوں شام ہوتی ہے دل کی حرکت تیز ہوتی ہے اور جھٹ پٹے کے وقت دیکھنے والے کو یہ جنگل موت کا بھیاںک سمندر معلوم ہوتا ہے۔ درخت اور جھاڑیاں سیاہ کھیل اوڑھ کر مخوں شکلیں اختیار کر لیتی ہیں۔ اس وقت سیر کرنے والے کا دل روشنی اور انسانی صحبت کے لیے تڑپتا ہے۔ وہ جلد جنگل سے نکل کر گھر کی طرف روانہ ہوتا ہے اور جب ایک دفعہ پھر وہ لیمپ کی روشنی میں اپنے ہم جنسوں میں جا بیٹھتا ہے تو اس کا دل خود بخود خدا کا شکر ادا کرتا ہے۔

لیکن صرف چار مہینے کے قلیل عرصے میں پیاری جان کی حفاظت کا جذبہ بہاری کا دماغ ان احساسات سے اسے معطل کر چکا ہے۔ انسانی خیالات اور محسوسات ساکت ہو چکے ہیں۔ ان کے بجائے خالص حیوانیت ترقی کر رہی ہے۔ سر اور داڑھی کے خوردرو پریشان بالوں سے گھرا ہوا چہرہ انسان کے چہرے سے بہت کچھ جدا معلوم ہوتا ہے۔ کمرے گھٹنوں تک اب بھی کپڑے کی چند لیریں لٹکی ہوئی ہیں۔ حرکات میں وحشت، چال میں چستہ کی سی چمک اور آنکھوں میں ہرن کا سا چوکنا پن ہے۔ اب وہ بیٹھ کر اپنی بد قسمتی کے واقعات سوچنے کے بجائے جنگل کی آوازوں پر کان لگا کر ان کے مطلب اخذ کرتا ہے۔ جنگل کی جڑوں اور پتوں سے بڑھ کر پرندوں کے انڈے، بھیرا لیتے پرندے، مرے گئے جانور اور دوسروں کا مارا ہوا شکار کھاتا ہے۔

ڈرا کر اسے سنے اگے چاند سے نکلا، دونوں چھوٹے بچے ساتھ تھے جن کی وجہ سے یہ بھاگ بھی نہیں سکتی تھی، جونہی یہ بچوں کو لیے چاند سے نکلی، سامنے درختوں پر بندھے ہوئے چانوں سے تڑاتڑ بندقوں کے قاز ہوئے، دو گولیاں اس کے لگیں اور ایک اس کے بچے کو دونوں وہیں ڈھیر ہو گئے۔ محمود کی گولی گردن پر، احمد میاں کی پانچ پر کبھی خطائی نہیں ہوئی۔ دوسرا بچہ پھر چاند میں گھس گیا جو کمل اور کپڑے ڈال کر زندہ ہی پکڑ لیا گیا۔

آج اس واقعے کو برسوں گزر گئے ہیں، اب بھی کہیں ایک سفید بڑھا لکڑی نیلے نیلے پھر کر زندگی کے کاروبار بھی کرتا ہے اور دن میں کئی دفعہ لکڑی کے سہارے بیٹھ کر اپنے اکلوتے بیٹے بلند یونٹھ کو یاد کر کے آنسو بہاتا ہے اور کہتا ہے ”اے بھگوان“ میں نے کونوں پاپ کیے تھے جو مجھے یہ سزا ملی ”اور اب بھی کہیں ایک گیارہ فٹ لمبا شاندار شیر اپنا لاغر جسم لچکاتا ہوا گھنٹوں کٹھن کی سلاخوں کے آگے گھومتا ہے اور جب سلاخوں سے نکلنے کا راستہ نہیں ملتا تو پیٹھ کر کسی دور دراز خیال میں غرق ہو جاتا ہے، تماشا کی تالیاں بھی بجاتے ہیں، کنکریاں بھی پھینکتے ہیں مگر اسے خبر نہیں ہوتی۔ وہ کسی گہرے خیال میں ہوتا ہے، شیر کیا سوچتا ہوگا؟ یارب! یہ دنیا کن گناہوں کا کفارہ ہے؟

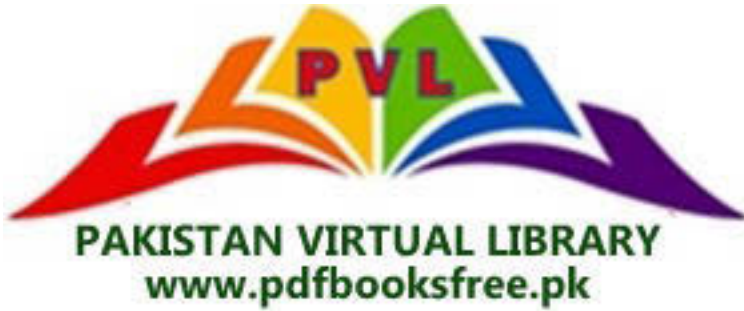


ایک دن حسب دستور مور نے کوک کر، میناؤں نے شور مچا کر اور بیدی کی رہنے والی مرغیوں نے کڑکڑا کر اطلاع کر دی تھی کہ جنگل کا بادشاہ اور اس کی ملکہ رات کے کاروبار سے فراغت کر کے دن بھر سونے کے لیے نرنگوں میں گھس گئے ہیں اور جب بندروں نے بھی درختوں سے اترنا شروع کیا تو بہاری بھی درخت سے اتر۔ رات کو سانپھروں کے بے تحاشا بھاگنے، جھٹلوں کے پوق پوق چلانے کے بعد چوکا کی طرف سے شیر کے فتح مندانہ گرجنے کی آواز سن چکا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ آج پھر تازہ شکار مارا گیا ہے۔

اب اس کے لیے یہی بہتر تھا کہ شام ہونے سے پہلے اس شکار کو ڈھونڈ لے جسے کہ شیر اور شیرنی نے انتہائی کمال سے کہیں چھپا دیا ہوگا۔ بہاری اس کی تلاش میں روانہ ہوا لیکن ڈھونڈتے ڈھونڈتے دن ڈھل گیا، وہ ناامید ہو کر یہ جستجو دوسرے دن کے لیے ملتوی کرنے ہی والا تھا کہ شکار کی گھنٹی پر اس کی نگاہ پڑ گئی، فوراً بہاری نشان پر روانہ ہوا۔ نرنگوں سے آدھ میل جنوب کی طرف سانپ لائن سے ہو کر یہ وہاں جا پہنچا جہاں نرنگل ختم ہو کر پانی اور کچھڑ میں گھٹا پیڑ کھڑا تھا۔ اب گوشت کچھ دور نہیں تھا۔ ضرور اسی پیڑ میں ہوگا، ایک کو ابھی وہاں بیٹھا تھا لیکن شام ہو چلی تھی، وہاں جانا محذور تھا۔ شیر کے نکلنے کا وقت آ گیا تھا، مگر بہاری کو تین دن کا قافہ آچکا تھا۔ اس نے ہمت کر جلدی سے تھوڑا گوشت کاٹ لیا، پانی میں چھپتا چھپاتا پیڑ کو دونوں ہاتھوں سے ہٹاتا، تیزی سے بڑھا۔ پتوں سے ڈھلے سانپھر تک پہنچا تھا کہ دور مور چلا یا، مرغیاں کڑکڑائیں۔ بہاری سانپھر پر جھکا ہوا تھا، ایک سیکنڈ کے لیے ٹھک گیا لیکن فوراً اس نے ارادہ کیا کہ ایک ہی ٹکڑا کاٹ لے۔ کھائی اور چری ہوئی سانپھر کی لاش پر ایک ہی وقت میں ایک جگہ دونوں ہاتھ جیسا سے گوشت کاٹنے میں لگ گئے اور دوسری جگہ اس کے دانت کچھ گوشت میں مصروف ہو گئے۔ دو لقمے پیٹ میں اور سیر بھر کا ٹکڑا ہاتھ میں لے کر بہاری بھاگا۔ پیڑ سے نکل کر تھماڑیوں میں سے ہو کر جس وقت وہ سانپ لائن پر آیا تو وہیں شیرنی کھڑی تھی۔ خاموش بجلی کی سی کندی، شیرنی کا چارمن کا جسم ایک ہی چھلانگ میں بھاگتے ہوئے بہاری پر گرا۔ کمر اور پسلیاں سٹیوں کی طرح چرچرائی چلی گئیں۔ بہاری شیرنی کے اگلے پیروں کے نیچے ایسا پڑا تھا جیسے کھوئی سے گری ہوئی اچکن پڑی ہو۔

شیر پیچھے رہ گیا تھا۔ وہ ان واقعات سے بے خبر ٹھہلا ہوا جیسے ہی قریب آیا، ٹھٹھک کر رک گیا۔ شیرنی نے لاش اس طرح منہ میں اٹھائی جیسے بلی نیم مردہ چوہا اٹھاتی ہے۔ شیرنی اسے جھٹکے دینے لگی۔ شیر کے منہ سے گھٹی ہوئی غراہٹ کی آواز نکلنے لگی۔ بہاری کے زمین پر گھسٹتے ہوئے پیر اور نکلنے ہوئے ہاتھ ہلنے دیکھ کر خوف سے شیر کی گردن کے بال کھڑے ہو گئے۔ شیر انسان سے نہیں ڈرتا تھا لیکن جنگل کے قوانین اس طرح شکن آلود ہوتے دیکھ کر تھرا گیا۔ وہ آہستہ سے گھوما اور خون خوں خوں غرا ہوا شیرنی کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر ایک طرف روانہ ہو گیا۔ ڈھائے سے اتر کر پیڑ اور اس کے بعد کلک کے جنگل سے نکلتا ہوا چوکا کو تیر کر نیپال کی طرف نکل گیا۔

انسان کے گوشت اور خون میں ایک عجیب مغف ہوتی ہے جس طرح کتے کے کانٹے سے انسان بولا یا ہو جاتا ہے، اسی طرح درندے انسان کے گوشت سے بولا جاتے ہیں پھر انہیں ہر وقت انسان ہی کی جستجو رہتی ہے۔ شیرنی کا بھی یہی حال ہوا۔ ایک بڑے اور دو گاڑی والوں کو مارنے کے بعد جب اسے اور آدمی چوکا ڈھایا کی طرف نہ ملے تو اپنے بچوں سمیت وہ نہر پار کر کے گھومتی گھومتی مزروعہ زمین اور گاؤں سے طے مینا کوٹ کی زمین داری کے جنگل میں آ گئی، یہاں آ کر اس نے متواتر کئی خون کیے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن دو پہر کے وقت ہانکا کر کے طرح طرح کی آوازوں سے



چنار گڑھ کا چیتا

میں ان دنوں چنار گڑھ میں فاریسٹ آفیسر کے طور پر کام کر رہا تھا۔ اس علاقے میں برسات بڑی زور سے ہوتی، جونہی برسات کا موسم شروع ہوتا تو اس علاقے میں چھوٹے چھوٹے مکھرے ہوئے دیہاتوں کے لوگ مختلف طریقوں سے بارشوں سے بچاؤ کی کوشش شروع کر دیتے لیکن اس کے باوجود ہر سال بہت سے کپے مکان گر جاتے تھے۔ اس موسم میں جانوروں کے لیے بھی شکار کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ اس لیے بعض اوقات چیتے اور شیر جیسے بڑے جانور آدم خوری پر اتر آتے۔ ایسا بھی ہوتا کہ پہاڑی ریچھ بھوک سے تنگ آکر انسان پر حملے بھی کر دیتے تھے۔ برسات کے موسم میں یہاں کے لوگ گاؤں کے قریب ہی رہتے اور اپنے مویشیوں کو درختوں میں جانے نہیں دیتے تھے۔ علاقہ کیونکہ پہاڑی اور میدانی ملا جلا تھا، پہاڑی ڈھلوانوں پر تو درخت کثرت سے تھے۔ یہ چیز اور دیودار کے بڑے گہرے سرسبز درخت تھے جو ڈھلوانوں پر کٹاؤ اور پتھروں کے ٹوٹنے کو روک کر رکھتے تھے لیکن نچلے میدانی علاقوں میں درخت چھوٹے چھوٹے ہو جاتے تھے یہاں کثرت سے سرسبز جھاڑیاں ہوتیں اور بعض اوقات یہ جھاڑیاں اتنا پھیل جاتیں کہ سالم ہاتھی ان میں چھپ سکتا تھا۔ ایسی جگہوں پر درخت بھی کافی تھے لیکن یہ زیادہ بلند قامت نہ تھے۔

میرا ریست ہاؤس ان علاقوں میں مکھرے بے نام سے ایک گاؤں کے شرق میں کھلی جگہ پر تھا۔ اگر درخت بہت کم تھے، بڑے اور گھنے درختوں کو صاف کر دیا گیا تھا تا کہ قریبی سڑک تک راستہ حاصل کیا جاسکے۔ ایک دن میں شہر سے ضروری سامان لے کر واپس آیا تو گاؤں سے اترتے ہی سب سے پہلی خبر جو میرے کانوں میں ڈالی گئی، وہ یہ تھی کہ پچھلے چند روز سے ایک چیتے نے ریست ہاؤس کے قریبی گاؤں میں اودھم مچا رکھا تھا۔ ایک آدھ دن چھوڑ کر وہ گاؤں سے بکری اٹھالے جاتا۔ رات کے وقت یہ درندہ اتنی چالاکی، مہارت اور دلیری سے حملہ کرتا کہ باوجود پہرے کے اس کے شکار میں فرق نہیں آیا تھا اور سب سے اہم اطلاع یہ تھی کہ آج اس گاؤں کے قریب جرتی ہوئی ایک گائے پر حملہ کر کے اسے مار ڈالا۔ اس حادثے کا سب سے اہم پہلو یہ تھا کہ جب گائے کے رکھوالے نے شور مچا کر چیتے کو ڈرانے کی کوشش کی تو اس نے رکھوالے پر حملہ کر دیا لیکن خدا کی قدرت کے چیتے کا چنچہ جو نبی رکھوالے کے کندھے پر پڑا تو وہ ڈر کے بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آنے پر اس نے دیکھا کہ اس کے کندھے پر چیتے کے پنجوں نے ہلکی خراش ڈال دی تھیں اور اس کے بے ہوش ہو کر گرنے کے بعد چیتا گائے کو گھسیٹتا ہوا کافی دور لے گیا تھا۔ رکھوالے نے پہلا کام یہ کیا کہ سرپنٹ گاؤں کی طرف بھاگ اٹھا۔

اب گاؤں کا کھیا، گائے کے رکھوالے کے ساتھ میرے پاس درخواست لے کر آیا تھا کہ میں چیتے کو شکار کروں، ورنہ شاید چند روز میں یہ جانور انسانوں کو شکار شروع کر دے۔ کھیا کے ساتھ اس کا نو جوان، جیتا جی رام بھی تھا جو اپنے چچا سے ملنے گاؤں آیا ہوا تھا وہ چیتے کو شکار کرنے میں بہت پرجوش دکھائی دیتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کے پاس بارہ بور کی بندوق بھی ہے جس سے وہ شکار کرتا رہا ہے اور اگر اب بھی اس کے پاس

بندوق ہو تو وہ چیتے کو بھی شکار کر سکتا ہے۔ میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ پرندوں اور چیتے کے شکار میں بڑا فرق ہوتا ہے لیکن اس کا لہجہ دیکھ کر میں خاموش رہا کیونکہ میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس کا نو جوان دماغ میری کوئی دلیل نہیں مانے گا۔ اس وقت شام ہونے والی تھی، میں اگر چہ تھا کہ ہوا تھا لیکن پھر بھی میں نے انہیں مدد کا یقین دلایا جس وقت تک میں نہا کرتا وہ دم ہوا، اس وقت تک جی رام اپنے چچا کو اپنی شکاری بیٹی کے عجیب و غریب واقعات سنا چکا تھا۔ جوش میں وہ کھڑا ہو جاتا اور اپنی اہلی دھوتی سنبھال کر ادھر ادھر پھرتا اور پھر کوئی نیا واقعہ سنانے لگتا۔

میں نے نہانے کے بعد اپنے دو آدمیوں کو ساتھ لیا۔ جی رام کھیا اور گائے کا رکھوالا بھی میرے ساتھ تھے۔ جی رام نے مندر کے مجھ سے ایک رائفل لے لی۔ مجھے کیونکہ پہلے سے کچھ اندازہ تھا، اس لیے ہم نے ایک کی بجائے دو چائیں باندھنے کا سامان ساتھ لیا جس وقت ہم گائے کی لاش تک پہنچے، اس وقت تک روشنی کافی کم ہو چکی تھی۔ میں نے گھاس سے خالی تھوڑی جگہ پر چیتے کے پیروں کے نشانات ڈھونڈے تو مجھے اندازہ ہوا کہ یہ بھاری جسامت کا چیتا ہے جو بارش کے موسم میں زیادہ شکار نہ ملنے کی وجہ سے آبادیوں کے قریب آ گیا ہے۔ چیتا گائے کو گھسیٹتا ہوا کافی دور لے آیا تھا۔ اس نے گائے کو ذرا بھی نہیں کھایا تھا جس سے مجھے یقین ہو گیا کہ چیتا رات کو ضرور آئے گا۔ اس کے بعد میں نے ان درختوں کا جائزہ لینا شروع کر دیا جس پر چنان باندھا جا سکتا تھا۔ گائے کی لاش جس درخت کے پاس پڑی تھی، وہ اچھی جسامت کا تھا جبکہ اس سے کچھ فاصلے پر ایک اور درخت تھا جس کا پھیلاؤ زیادہ تھا لیکن اونچائی زیادہ نہ تھی۔ دونوں درختوں پر چائیں باندھ دی گئیں تو میں نے جی رام سے کہا کہ اس چنان پر بیٹھ جائے جو زیادہ اونچائی پر ہے۔ یہ چنان قریباً مردہ گائے کے جسم کے اوپر بیٹھ کر افس فٹ کی بلندی پر تھا اور اس چنان سے زیادہ محفوظ تھا جس پر مجھے بیٹھنا تھا۔

میں نے کھیا یعنی گاؤں کے نمبردار اور اپنے آدمیوں کو واپس بھیج دیا اور سختی سے ہدایت کی کہ اس وقت تک کوئی بھی چنان تک نہ آئے جب تک متواتر تین فائرز کی آواز نہ سن لے۔ ان کے جانے کے بعد میں اور جی رام اپنی اپنی چائوں پر بیٹھ گئے، کیونکہ اندھیرا بڑا جلدی پھیلتا جا رہا تھا۔ میری اور جی رام کی چنان کے درمیان کوئی تیس گز کا فاصلہ تھا جہاں سے میں جی رام کی حرکات کو فور سے دیکھنے پر محسوس کر سکتا تھا۔ چنان پر بیٹھ کر میں نے جنگل کے ماحول کو محسوس کیا۔ چاروں طرف جانوروں اور پرندوں کی رنگ برنگی آوازیں گونج رہی تھیں۔ میرے پیچھے کی پہاڑی ڈھلوان سے بندروں کا شور پورے تسلسل سے جاری تھا۔ کبھی کبھی سور کی اونچی گونج دار آواز بازگشت بن کر ابھرتی اور پہاڑیوں میں بکھر جاتی لیکن جوں جوں اندھیرا پھیل رہا تھا، اسی حساب سے پرندوں کی آوازیں کم پڑتی جاتی تھیں لیکن جانور اب پہلے کی نسبت زیادہ بول رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد گھپ اندھیرا ہو گیا۔ آسمان صاف تھا اور تھوڑی ہی دیر بعد چاند ابھر آیا جس سے چیزیں بڑی واضح نظر آنے لگیں۔ اب اکا دکا جانور کی گونج دار آواز پہاڑیوں میں چکراتی ہوئی دم توڑ دیتی۔ میرا خیال تھا کہ چیتا نصف شب کے قریب آئے گا، لیکن اچانک پہاڑی ڈھلوان پر بندر زور سے خوشیائے۔ میں نے احتیاط سے گھڑی دیکھی، ساڑھے دس ہوئے والے تھے۔ بندروں نے اعلان کر دیا تھا کہ چیتا آن پہنچا ہے جس کے آنے کی مجھے اتنی جلدی امید نہ تھی لیکن بندروں نے خطرے کی آواز نکالی تو میری سبھی حیات بیدار ہو گئیں۔

سامنے درخت پر جی رام کا ہیولا بھی نظر آ رہا تھا، لگتا تھا کہ وہ بھی چیتے کی آمد کے بارے میں جان چکا ہے۔

میں نے خاموشی کے ساتھ چیتے کی حرکات کو سننے کی کوشش کی لیکن چالاک درندہ ذرا بھی آواز پیدا نہیں کر رہا تھا اور پھر اچانک ہی میں نے

شمیر گڑھ کا ریکھ

میری دائیں ٹانگ پر ٹخنے سے ذرا نیچے تین لکیریں سی بنی ہوئی ہیں کسی روز اگر اچانک ان پر نظر پڑ جائے تو میں ان پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنے لگتا ہوں، کئی دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ میں ٹانگ پر ہاتھ رکھے رکھے سوچوں میں کھوجاتا ہوں، سوچیں مجھے ماہ و سال کی قید سے دور پھر جوانی کے اسی دور میں لے جاتی ہیں جب خطرات مول لینے میں مزہ آتا تھا۔

فاریسٹ آفیسر میں اگر شکار کا شوق موجود ہو تو پھر اس کی زندگی میں خطرات کو گھیر کر لانے کے بہت سے مواقع موجود ہوتے ہیں، یہی کچھ میرے ساتھ ہوا اور کئی بار ہوا۔ جنگلات کا سروے کرتے پودوں کے بارے میں مختلف اعداد و شمار اکٹھے کرتے بہت سے مواقع ایسے آتے رہتے کہ جنگلی جانوروں سے لڑائی کی نوبت آ جاتی۔ ایسے میں اگر بندہ اچھا، دلیر اور محتاط شکاری نہ ہو تو جانور بڑی جلدی اسے زندگی اور انگریزوں کی نوکری سے آزاد کر دیتا ہے، کیونکہ بعض اوقات جنگلات کی کٹائی کے لیے بہت سے مزدوروں کی ضرورت پڑتی تھی جس کی وجہ سے جانوروں کو وہ علاقہ چھوڑنا پڑتا بعض اوقات جانور غصے میں حملہ بھی کر دیتے یا ایسے گوشت خور جانور جیسے شیر، تیندوے اور چیتے آدم خوری پر بھی اتر آتے تھے، کیونکہ جنگل کے تیز رفتار جانوروں کی نسبت انسان ان کے لیے آسان شکار ثابت ہوتا تھا۔

لکڑی کاٹنے والے مزدور جنگل میں کیپ سا بنا لیتے جہاں تھوڑے تھوڑے عرصہ بعد کوئی نہ کوئی واردات ضرور ہو جاتی۔ میری ٹانگ کی تین لکیریں بھی ایک ایسے ہی کیپ کی یادگار ہیں۔ ہمارا کیپ شمیر گڑھ سے تقریباً بیس کلومیٹر کی دوری پر گھنے جنگل میں تھا۔ شمیر گڑھ گھنے جنگلوں کے کنارے پر آخری قصبہ تھا۔ حکومت کا خیال تھا کہ شمیر گڑھ سے لے کر کنر یا ل تک سڑک بنادی جائے۔ یہ تقریباً ایک سو پچاس کلومیٹر کا فاصلہ تھا اور سڑک کا زیادہ تر حصہ گھنے جنگل میں بنایا جانا تھا۔ چنانچہ جنگلات کی کٹائی کا کام شروع کر دیا گیا، مزدوروں نے شمیر گڑھ سے بیس کلومیٹر پر اپنلے کیپ بنا لیا تاکہ ہر روز واپس شمیر گڑھ تک کا فاصلہ طے نہ کرنا پڑے۔

کیپ میں آئے ہوئے ابھی سات آٹھ روز ہی ہوئے تھے کہ جب پہلی واردات ہوئی، مزدوروں کو اندازہ تھا کہ جنگل میں جانور کثرت سے ہیں، چنانچہ سونے سے پہلے کیپ کے بیرونی کناروں اور درمیان میں آگ کا لاؤروٹن کر لیتے تھے تاکہ جانور آگ کے ڈر سے دور ہی رہیں لیکن اس رات مزدوروں کا خیال غلط ثابت ہوا، میری آنکھ مزدوروں کے شور سے کھل گئی، گھبرا کر باہر نکلا تو دیکھا ہر کوئی افراتفری میں ادھر ادھر بھاگ رہا ہے۔ صرف اتنا پتہ چل رہا تھا کہ کیپ میں شیر آ گیا ہے، میں نے جلدی سے رائفل اٹھائی اور جائے واردات کی طرف بھاگا۔ مزدوروں نے چھوٹے چھوٹے خیمے سے بنائے ہوئے تھے اور شیر کنارے والے خیمے میں خاموشی سے داخل ہو کر ایک مزدور کو نہ میں دبائے چلا بنا تھا۔

مزدور کی گھٹی گھٹی چینوں سے اس کے دوسرے ساتھی بھی جاگ اٹھے اور اب ہر کوئی اپنے اندازے کے مطابق شیر کی لمبائی بتا رہا تھا۔ ان

اس کا وجود محسوس کر لیا۔ مردہ گائے سے بائیں طرف کی جھاڑیوں میں چیتے نے آہستہ سے گردن نکالی، اس وقت تک چاندنی خوب پھیل چکی تھی۔ چیتا چند لمحوں میں رکا پھر باہر نکل آیا وہ واقعی بڑی جسامت کا تھا جو احتیاط سے مردہ گائے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میری پوزیشن ایسی تھی کہ اگر میں اس کا نشانہ لینا چاہتا تو مجھے رائفل سامنے کے رخ پر لانا پڑتی اگر میں رائفل بلاتا تو مجھے یقین تھا کہ چیتا میری حرکت کو دیکھ کر فوراً بھاگ جاتا۔ اب مجھے انفسوس ہو رہا تھا کہ میں نے یہ سوچتے ہوئے کہ چیتا دائیں ہاتھ کی چھلی طرف سے آئے گا تو رائفل بھی اسی طرف رکھ لی تھی لیکن چیتا بائیں ہاتھ سامنے جھاڑیوں میں سے نمودار ہوا تھا۔

اتنی دیر میں چیتا گائے تک پہنچ گیا۔ اس نے بیٹھ کر دونوں نچے گائے کی پھلی ٹانگ پر رکھے اور گوشت اُدھیرنے لگا۔ میں حیران تھا کہ جیسی رام فائر کیوں نہیں کر رہا۔ یہ سوچ کر میں نے غیر ارادی طور پر پچان کی طرف نظر اٹھائی۔ جب مجھے احساس ہوا کہ جیسی چیتے کے خوف سے بت بن چکا ہے۔ دوبارہ جب چیتا گائے کا گوشت اُدھیرنے میں مصروف ہوا تو میں نے آہستہ سے رائفل سیدھی کر لی۔ اگلی بار رائفل کندھے تک اٹھا کر میں نے شہت بانگھی اور ٹھیک اس لمحے جب میری انگلی ٹرائیگر کو چھو رہی تھی، اچانک ایسا واقعہ ہوا کہ اگر اچانک اس رات سورج بھی نکل آتا تو میں اتنا نہ گھبراتا۔ اچانک ہی جنگل کی خاموش فضا چراں..... کی خوفناک آواز سے گونج اٹھی اور وہ موٹی شاخ جس پر جیسی رام کا پچان بندھا ہوا تھا، بمعہ پچان کے چیتے پر آن گری، اس وقت اندازہ کرنا مشکل تھا کہ میرے اور چیتے میں سے کون زیادہ خوف زدہ ہے۔ چیتے نے ایک دہشت انگیز چیخ بلند کی اور چشم زدن میں جھاڑیوں میں غائب ہو گیا، تب ایک اور چیخ گونجی میں نے گھبرا کر سامنے دیکھا تو جیسی رام اس شاخ سے ٹکٹ نظر آیا جو پچان کے بالکل اوپر تھی۔ یہ سارا واقعہ شاید پانچ سے دس سیکنڈ میں رونما ہو گیا۔ جس وقت مجھے احساس ہوا کہ کیا ہو چکا ہے تو بے اختیار میری دلی دہلی ہنسی نکل گئی، ادھر جیسی رام جس شاخ سے لٹکا ہوا تھا، وہ اس پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے جھاڑیوں میں پہلا فائر کیا تو سارا جنگل خوفناک دھماکے سے گونج اٹھا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دوسرا فائر کیا اور جیسی رام کو آواز دی کہ وہ شاخ سے اتر کر میری پچان پر آ جائے۔ جتنی دیر میں سہا ہوا جیسی رام میری پچان تک آیا، میں چاروں طرف دیکھتا رہا ویسے مجھے اُمید نہیں تھی کہ دو فائروں کے دھماکے کے بعد چیتا کہیں قریب نہ ہوگا۔

جیسی کے آنے کے بعد میں نے رائفل اس کو تھمائی اور خود سکون سے سستانے لگا۔ جیسی کے منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔ اس لیے میں نے اسے مزید تنگ کرنا مناسب نہ سمجھا۔

صبح جس وقت کھیا اور میرے آدی مجھے لینے آئے تو جیسی رام بخاری شدت سے تپ رہا تھا۔ پچان گائے کے مردہ جسم پر پڑا تھا اور میں سو رہا تھا۔ یہ ایک الگ کہانی ہے کہ اگلے چوبیس دن مجھے چیتے کے شکار میں خوار ہونا پڑا اور جب وہ ساتویں بکری کا شکار کرنے آیا تو میرا شکار بن گیا، لیکن جیسی رام کے ساتھ بہت بُرا ہوا۔ تین دن وہ بخاری میں ہزریان بک رہا۔ میں اسے جیب میں ڈال کر شہر کے ہسپتال میں لے گیا جہاں اسے سدرست ہونے میں کافی دن لگے، لیکن اب بھی جب کبھی پچان گرنے کا یہ واقعہ یاد آ جاتا ہے تو بے اختیار مسکرا کر رہ جاتا ہوں۔



کی باتوں سے لگتا تھا کہ شیر گدھے سے لے کر ہاتھی سے ذرا بڑا ہو سکتا ہے۔ بعد میں جب تفصیلاً بات ہوئی تو پتہ چلا کہ جس شخص کو پہرے پر مقرر کیا گیا تھا وہ سکون سے اپنے خیمے میں سویا ہوا تھا، ورنہ شاید شیر کی آمد کا پتہ چل جاتا اور مزدور کی جان بچ جاتی۔

اس حادثے کے بعد باقی ساری رات مزدوروں نے اونگھتے جاگتے گزاری۔ ذرا سی آہٹ پر سبھی ہڑ بڑا کے ادھر ادھر دیکھنے لگتے۔ مجھے اندازہ تھا کہ شکار کرنے کے بعد کم از کم آج تو شیر اس طرف نہیں آئے گا۔ دوسری طرف مجھے حیرانی بھی تھی کہ اس علاقے میں آدم خور کیسے آ گیا ہے کیونکہ ابھی تک یہاں کسی آدم خور شیر کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔

صبح سویرے میں نے شیر کے پاؤں کے نشان ڈھونڈنے کی کوشش کی، لیکن ہر طرف مزدوروں کے ننگے پاؤں کے نشانات ہی نظر آئے۔ زمین پر لاش کے ٹھینے کا کوئی واضح نشان نہ تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ شیر کا فی طاقور ہے اور لاش کو منہ میں اٹھا کر لے گیا ہے، لیکن خیمے کے اندر جدوجہد کے کافی ثبوت تھے۔

میں نے اپنے ساتھ دلیر مزدور لیے اور اندازے سے ہی شیر کی تلاش میں نکل پڑا۔ کیونکہ کوئی بھی مزدور اس وقت کام کرنے کو تیار نہ تھا جب تک کہ شیر کو مار نہ دیا جاتا۔ کیمپ سے باہر آ کر تھوڑی دور ہی مجھے خون کے ہلکے ہلکے نشانات نظر آنے لگے۔ آگے چل کر قد آدم جھاڑیاں اور درخت اتنے گھنے گھنے ہو گئے کہ خون کے نشان تلاش کرنا پڑے تھے۔ ارد گرد درختوں سے سینکڑوں پرندوں کی آوازوں سے جنگل گونج رہا تھا جس سے ثابت ہوتا تھا کہ یا تو شیر اس علاقے سے نکل چکا ہے یا ابھی کسی جگہ پر سویا ہوا ہے، چلتے چلتے ہمیں کوئی تین چار گھنٹے ہو گئے، جنگل میں دہلی دہلی سی گرمی بھر گئی تھی، کم جگہوں پر ہی روشنی زمین تک پہنچتی تھی۔ جس کی وجہ سے درختوں کے نیچے خوشگوار ٹھنڈک کا احساس ہونے لگتا۔ ہم نے ایک جگہ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ تھوڑی دیر وہاں سستاتے رہے۔ جب ہم آگے بڑھے تو دھوپ ڈھلنے لگی تھی، میرے دونوں ساتھی زیادہ پریشان نہ تھے۔ ایک اونچا لمبا گھنی مونچھوں والا لکھ تھا جس کا نام شاندرام سنگھ یا مان سنگھ تھا۔ دوسرا ایک نوجوان مسلمان بشیر حسین تھا، دونوں دلیر اور محنتی تھے۔ کیونکہ انہوں نے کبھی شیر اور وہ بھی آدم خور کے شکار میں حصہ نہیں لیا تھا، اس لیے انہیں ان خطرات کا احساس نہ تھا جو شیر کے شکار میں کو گھیرے رکھتے ہیں لیکن میں اپنے ارد گرد گھنے جنگل سے مسلسل خطرہ محسوس کر رہا تھا کیونکہ ہم جس شیر کو ہلاک کرنے آئے تھے، وہ عام درندہ نہیں بلکہ آدم خور تھا اور آدم خور شیر نہایت چالاک، بے رحم اور غرور ہوتا ہے۔

تھوڑا آگے بڑھنے پر چھوٹی چھوٹی ٹیکریاں سی آگئیں۔ یہ میٹھی اور پتھروں کی بنی پہاڑیاں تھیں جن میں بل کھودنا آسان تھا۔ اس لیے بہت سے جانور ایسی جگہوں پر رہتے تھے ہم گھوم کر پہاڑی سے آگے بڑھنے لگے۔ ابھی چلتے ہوئے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ اچانک جھاڑیوں کے پیچھے سے خوفناک چیخ مارتا ہوا ایک بڑی جسامت کا ریچھ نکل آیا۔ فاصلہ اتنا کم تھا کہ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ ریچھ کا پہلا پیچہ میرے پائوں کے نیچے کی جانب اتنی زور سے لگا کہ میں قلابازی کھا کر پانچ فٹ دور جا گرا۔ چند لمحوں کے لیے تو میرا ذہن بالکل سن ہو کر رہ گیا، لیکن اس وقت ہوش و حواس کھونا گویا ریچھ کو دعوت دینا تھا کہ آؤ اور مجھے شکار کر لو۔ گھبراہٹ میں میں نے رائفل کی تلاش میں ادھر ادھر ہاتھ مارے لیکن اس زبردست جھٹکے سے رائفل اُچھل کر چار پانچ فٹ دور جھاڑی میں جا گری تھی۔ ادھر ریچھ سخت غیض و خشم سے مجھ سے چند قدم دور دونوں ٹانگوں پر کھڑا تھا، وہ جب بھی

غراتا تو سفید دانتوں کی لمبی قطار نظر آنے لگتی۔ میری امید رائفل کے ساتھ مجھ سے چند قدم دور پڑی ہوئی تھی، جب میری نظر مان سنگھ اور بشیر پر پڑی۔ مان سنگھ حملے کے صدمے سے جیسے بت بن گیا تھا اور ایک مائع مقل سے انداز میں ساکن کھڑا تھا۔ بشیر حسین کو نا جانے کیا سوجھی، اس نے اونچی آواز میں پتھیں مارنا شروع کر دیں، مجھے غصہ آ رہا تھا کہ وہ اپنی بددوق سے ریچھ کو گولی کیوں نہیں مار رہا۔ اسی لمحے ریچھ نہایت غصے میں مڑا، ابھی اس نے بشیر کی طرف تیسرا پیچہ قدم اٹھایا تھا کہ میں نے لپک کر رائفل اٹھالی۔ سات آٹھ فٹ کی دوری پر رائفل کی وزنی گولی نے ریچھ کو ساکن کر دیا، وہ ایک لمحے سے بھی کم مدت میں میری طرف مڑا تو اس کا منہ کھل چکا تھا، آنکھوں اور دانتوں کی قطاروں سے خون چمک رہا تھا۔ وہ جیسے نشے میں ادھر ادھر جھول رہا تھا۔ میں نے سمجھ لیا کہ اب کسی لمحے بھی ریچھ گر پڑے گا، لیکن پھر ریچھ نے ایسی تیزی سے حملہ کیا کہ میں اس کی طرف ایک جھٹک ہی دیکھ رہا جس کا وقت ریچھ کے پیچھے نے رائفل کی نالی کو چھوا تو میں دوسری گولی چلا چکا تھا۔

ریچھ کے جھٹکے سے میں اور گولی کی قوت سے ریچھ پیچھے گر پڑا۔ لیکن اگلے سیکنڈ میں اس کے بڑے پیچے نے میری دائیں ٹانگ اور ہیز ڈالی۔ درد کی ایک تیز لہر میرے دماغ تک پھیل گئی۔ آخری چیز جو مجھے یاد تھی وہ یہ کہ بشیر حسین نے اپنی بددوق لٹھی کی طرح ریچھ کے سر پر دے ماری۔ ایک آدھ منٹ بعد ہی میرے اوسان بحال ہوئے تو اس وقت بشیر اور مان سنگھ مجھے گھسیٹ کر ریچھ سے تھوڑی دور لے آئے تھے۔ میں نے اٹھ کر دیکھا تو ریچھ مچر چکا تھا لیکن میری دائیں ٹانگ پر اس کے لمبے ناخن تقریباً آدھ انچ گہرے اور گیارہ بارہ انچ لمبے زخم لگا کر مجھے لبو لبہاں کر چکے تھے۔ زخموں سے خون تیزی سے بہہ رہا تھا چنانچہ بشیر اور مان نے کپڑے سے کس کر میری ٹانگ باندھ دی۔

ریچھ وہیں چھوڑ کر دونوں نے مجھے سہارا دیا اور ہم واپس چل پڑے، راستے میں جب میں نے بشیر سے پوچھا کہ اس نے گولی کیوں نہ چلائی تو اس نے بڑی معصومیت سے جواب دیا کہ ریچھ اور میں اتنے قریب تھے کہ کار تو س چلانے پر مجھے یقیناً تھمرے لگ جاتے۔ بشیر کو جہاں خوشی تھی کہ میری جان بچ گئی، وہاں اسے افسوس بھی تھا کہ اس کی محنت سے خریدی ہوئی بددوق ریچھ کی کھوپڑی پر مارنے سے دو ٹوکے ہو چکی تھی۔ جس وقت ہم کیمپ پہنچے تو ہلکا سرخی اندھیرا پھیل چکا تھا، میں نے جاتے ہی دوئی سے زخم دھوئے اور چند دوسری گولیاں کھا کر سو گیا۔ کیونکہ مجھے ہلکا بخار ہو رہا تھا۔ میں ڈر بھی رہا تھا کہ کہیں زخموں میں زہر نہ پھیل جائے، لیکن اس وقت اگر واپس چلا جاتا تو کیمپ کے سارے مزدور بھاگ جاتے۔ ساری رات مزدور باری باری پہرہ دیتے رہے اور کئی بار شیر کے بولنے کی آوازیں کیمپ کے ارد گرد سے آتی رہیں۔ آدم خور بھوک مٹانے کی فکر میں تھا لیکن اب شاید اس کے لیے ممکن نہ تھا۔

دوسری صبح میں جاگا تو بخار تیز ہو گیا تھا لیکن میں نے محسوس نہ ہونے دیا۔ مان سنگھ اور بشیر کو ساتھ لے کر میں پھر شیر کی تلاش میں نکل پڑا۔ آج خطرہ کل کی نسبت زیادہ تھا، آدم خور کی بھوک اس سے زیادہ قائل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ہم زیادہ احتیاط سے قدم رکھ رہے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ اگر شیر کہیں قریب ہوا تو پرندوں یا درختوں پر لٹکے بے شمار بندر ضرور چھینیں گے۔ اچانک دائیں ہاتھ کا فی فاصلے پر چھین کی خطرے سے آگاہ کرنے والی پکار سنائی دی، لگتا تھا شیر یا اور کوئی درندہ پھیل کے قریب ہے، ہم اسی طرف بڑھ گئے۔

تھوڑی دیر بعد چھوٹی سی خشک چٹان آگئی جس پر کہیں کہیں گھاس کی جھاڑیاں سی تھیں۔ بشیر میرے آگے تھا اور مان سنگھ نے دو قدم پیچھے رہ

پاگل شیرنی

پہاڑ کے نیچے میں کرل ولسن کے شکاری یکمپ میں پہنچا ہی تھا کہ سورج غروب ہو گیا۔ کرل کی حالت زار دیکھ کر مجھے بہت رنج ہوا۔ میلے کپڑے، بوچی ہوئی سنہرے رنگ کی داڑھی اور بڑی بڑی نیلی آنکھوں میں غم کی جھلکیاں۔ میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ میں رسالدار ہوں۔ ڈیرہ دون سے آپ کی خدمت میں مجھے کرل ہیرن نے بھیجا ہے۔ وہ بولے میں نے ہی کرل ہیرن کو لکھا تھا کہ آپ کو بھیج دیں۔ میں آپ کو جانتا ہوں، نیپال کی ایک شکاری مہم میں آپ کرل وارن، راجہ جنگ بہادر اور کیپٹن اسٹرٹیک تھے۔ کیپٹن اسٹرٹیک ہاتھ شیر نے منہ میں لے کر چبا ڈالا تھا، جو بعد میں کاٹ دیا گیا، آپ کو یہ سن کر افسوس ہوگا کہ میں بد قسمت کیپٹن اسٹرٹیک چھوٹا بھائی ہوں، ہمیں ہندوستان میں شکاری زندگی راس نہیں آئی۔ یہ تصویر دیکھئے۔

میں نے تصویر دیکھی ایک نوجوان انتہائی خوب صورت یورپین لڑکی کا فوٹو تھا۔ کرل ولسن نے گلوگیر آواز میں اپنے اور میرا کے رومان اور شادی کی جوالہناک داستان سنائی۔ وہ سن کر میرے روٹنے لگے۔ کرل ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔ میں ایک تجربہ کار شکاری ہوں لیکن ان پہاڑوں میں ایک مہینہ ٹکریں مارنے کے باوجود میرا کی بڑا سرا موت کا معرہ مل نہ کر سکا۔ کیا کوئی بتا سکتا ہے وہ کیا بلا ہے جس نے میرا کو مجھ سے ہمیشہ کے لیے جھین لیا ہے؟

رات گزر گئی۔ دوسرے دن میں اور کرل ولسن ایک جنگلی راستے پر چل پڑے۔ یہ سانپ کی طرح مل کھاتا تنگ راستہ تھا جس کے دونوں طرف جھاڑیوں، لمبی گھاس اور درختوں کی بھرمار تھی جب گھنے جنگل میں داخل ہوئے تو ہمارے سر پر آسمان سے باتیں کرتی ہوئی سرسبز پہاڑی چوٹی تھی۔ اس مقام کے قریب ہی شمال کی جانب چناروں کے درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ ہم اس جھنڈ میں داخل ہوئے تو بمشکل چند قدم دور دیکھ سکتے تھے۔ کرل نے کہا۔ ”یہ جگہ میرا کو بہت پسند تھی۔ وہ آبشار ہے یہ آپ کے سر پر اوپر درخت پر جو چھان بندھا ہوا ہے میں اور میرا کئی راتیں اس چھان پر بیٹھے رہے۔ کوئی درندہ نہ آیا۔“

ذرا آگے بڑھے، سامنے ایک بھیا تک خشیب تھا جس کے ارد گرد سال کے درخت کھڑے تھے، ہم خشیب میں اتر گئے وہاں سبز گھاس کا فرش اور چھوٹے چھوٹے درخت تھے جن کی ٹہنیاں اور شاخیں زمین کو چھو رہی تھیں۔ خود رو بیلیوں نے جال تباہا تھا۔ وہیں ایک چشمہ بھی تھا۔ کرل نے کہا۔ ”ہمارا مقصد شکار رکھنا نہیں تھا بلکہ ہم نے مٹی مون منانے کے لیے ان دشوار گزار وادیوں کو منتخب کیا تھا اور ہمارا ارادہ جس جگہ دریائی جھناٹا ہے یعنی جنوینی پینچنے کا تھا۔ وہ یہاں سے سو میل دور ایک پہاڑی مقام پر واقع ہے۔ وہیں دریائے جھنا کا منبع ہے، وہ سامنے دریا اسی جگہ سے ادھر آ رہا ہے لیکن میرا حسن فطرت کا یہ دل کش منظر دیکھ کر ہمیں کی ہو رہی۔ ایک دوپہر کو میں مرغ کا شکار کر کے لایا تو میرا نہیں تھی۔ مجھے گھڑ والی

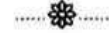
کر چٹان پر چڑھنا شروع کیا۔ اچانک بشیر پتھروں پر لیٹ گیا اور خاموشی سے مجھے آگے آنے کو کہا، اس وقت بخار کی وجہ سے مجھے لگ رہا تھا جیسے کانوں اور سر سے دھواں سا اٹھ رہا ہے۔ بڑی مشکل سے رینگتا ہوا بشیر کے پاس چلا گیا۔ اس نے مجھے پہاڑی سے دوسری طرف دیکھنے کو کہا، میں نے ذرا سی گردن اٹھائی تو وہ مجھے نظر آ گئے۔ یہ شیرنی اور اس کے تین بچے تھے۔ چاروں تقریباً سو گز دور چھوٹے سے گھاس کے میدان میں کسی گولی سی چیز سے کھیل رہے تھے۔ شیرنی اور اس کے بچے فٹ بال کی طرح اس گول چیز کو لڑھکاتے اور پھر ادھر ادھر فلا بازیاں کھا کر اسے پکڑنے کی کوشش کرتے۔

بشیر نے مجھے متوجہ کر کے کہا جناب وہ سر..... میں نے غور سے دیکھا تو ایک لمبے کے لیے میرا خون خمد ہو کر رہ گیا۔ کیونکہ شیرنی اور اس کے بچے جس چیز سے کھیل رہے تھے وہ کوئی پتھر نہیں بلکہ انسانی سر تھا، جس وقت میں نے رائل کانڈھے سے لگا کر شیرنی کا نشانہ لیا تو میری حالت عجیب سی ہو رہی تھی، دل چاہتا تھا کہ شیرنی کو نہ ماروں کیونکہ ابھی اس کے بچے چھوٹے ہیں، لیکن دماغ کہتا تھا کہ اگر اسے مارا نہ گیا تو یہ مزید کئی انسانی جانوں کا نقصان کرے گی اور ہو سکتا ہے کہ تینوں بچے بھی انسانی گوشت کھا کھا کر آدم خوری پر اتر آئیں، تب مجھے یہ احساس بھی ہوا کہ بچوں کی وجہ سے شیرنی زیادہ بھاگ دوڑ نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے یکمپ میں سے مزدور کو شکار کر لائی تھی۔

چند لمبے جب میں نے فائر نہ کیا تو مان سنگھ بولا ”صاحب کیا سوچتے ہو، شیرنی بھاگ جائے گی“ میں نے ٹرائیگر پر انگلی رکھی، جس وقت میں ٹرائیگر دوبارہ ہاتھ، اسی لمبے شیرنی کی نظر ہم پر پڑ گئی۔ خوف ناک وحشت سے اس نے گردن اٹھالی لیکن میری انگلی ٹرائیگر دبا چکی تھی۔ شیرنی نے زبردست جھٹکا کھایا اور وہیں لوٹ پوٹ ہو گئی۔ دھماکے کے ڈر سے تینوں بچے بھاگ گئے۔ ہم نے تھوڑی دیر انتظار کیا اور پھر آگے چلے گئے۔ اگرچہ آدم خور شکار ہو چکی تھی لیکن نبھانے کیوں دل پر بوجھ سا پڑ گیا تھا۔

اسی روز شام کو مجھے شہر کے بڑے ہسپتال میں داخل کروادیا گیا کیونکہ بخار تیز ہوتا جا رہا تھا، تین دن بعد بشیر مسکراتا ہوا آیا اور اس نے بتایا کہ پھندہ لگا کر شیرنی کے تینوں بچے بھی پکڑ لیے گئے ہیں، جنہیں افسران نے چڑیا گھر کے حوالے کر دیا تھا۔

اگلے ستائیس دن میں ہسپتال کے بستر پر پڑا، شیرنی اور اس کے بچوں اور بد معاش رچھ کے بارے میں سکون سے سوچتا رہا۔



ملازموں سے پتہ چلا کہ وہ جسٹس پر گئی ہے۔ میں یہاں آیا اس جسٹس کے کنارے میراں کا بایاں ہاتھ کٹا پڑا تھا۔ کلائی سے گھڑی بندھی ہوئی تھی۔ قریب ہی خون کے ایک بڑے دھبے پر اس کی بندوق اور کتاب پڑی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر مجھ پر بجلی سی گری۔ رات کو کچھ حواس درست ہوئے تو نیچے کے اندر میرے ملازم رنج و غم کی تصویر بنے پھنی پھنی نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ بعد میں، میں نے میراں کی پڑا سر ارموت کے معرہ کو حل کرنے کے لیے جو جدوجہد کی وہ بیان نہیں کر سکتا، بالآخر نا کام ہو کر میں حوصلہ ہار بیٹھا۔

کرتل کے آنسو نکل آئے۔ میں نے حقائق پر غور کیا، بازو کو جسم سے کاٹ کر پھینک دیا۔ لاش لے جانا بڑا عجیب سا واقعہ تھا۔ کرتل کے بیان کے مطابق بازو پر شیر کے دانت کا نشان نہیں تھا۔ تاہم میں آٹھ راتیں کسی انتہائی بلا کے انتظار میں جسٹس کے اوپر درخت پر بیٹھا رہا۔ کوئی قابل ذکر واقعہ رونما نہ ہوا۔ میں نے کرتل سے کہا کہ مجھے اس ہم کو سر کرنے کے لیے اکیلا چھوڑ دیجئے، میں کمپ سے غیر حاضر رہوں گا اور مقصد مل ہوتے ہی کوئی کارروائی کرنے سے پیشتر آپ کو خبر دوں گا۔ صبح کا وقت تھا، میں جسٹس پر بیٹھا کھانا کھا رہا تھا، یک لخت مجھ پر جنون سا طاری ہوا اور میں نے سامنے کھڑی فلک بوس پہاڑی کی چوٹی پر چڑھنے کا فیصلہ کر لیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر پانی پیا اور پھر بندوق اور بیٹھے ہوئے چنوں کا تھیلہ گلے میں ڈالا اور کمر گرم کبل باندھ کر پہاڑی پر چڑھنا شروع کر دیا۔ آگے ایک خطرناک عمودی چٹان آگئی۔ میں اب اوپر کی طرف رینگ رہا تھا۔ ایک نظر نیچے کی طرف دیکھا تو اتنی گہری کھائیاں تھیں کہ میرا رواں لرز اٹھا، میں آنکھیں بند کر کے چھپکی کی طرح اس چٹان پر چڑھ گیا۔

آگے ہموار پہاڑی سلسلہ تھا۔ پہاڑ کی چوٹی بہت بلند تھی۔ تھوڑی دور چل کر اس قدر گھٹا پہاڑی جنگل آیا کہ سورج بھی نظر نہ آتا تھا۔ تاریک جنگل ختم ہوا تو ایک انتہائی دل کش اور جاذب نظر مقام آ گیا۔ اس مقام کے تین طرف سفید چمکدار پہاڑی فصیل تھیں اور مغرب کی جانب درختوں کی دیوار کھڑی تھی۔ قریب ہی شفاف پانی کا ایک دل فریب تالاب تھا جس کے چاروں طرف سبزے کا فرش اور خورد و پھلوں کی آگے ہوئی تھیں۔ سورج غروب ہوا تو میں نے وضو کے مغرب کی نماز ادا کی، پھر بیٹھے ہوئے پٹے کھا کر رات بسر کرنے کی غرض سے ایک درخت پر چڑھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد بندروں کی خرخر کی آواز آئی، میں نے تالاب کی طرف دیکھا، شام کے دھندلکے میں بڑا ہولناک منظر تھا۔ ایک قوی ہیکل بندر نے کافی لمبے سیاہ ناگ کا پھن ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا اور وہ سانپ بندر کے جسم سے لپٹا ہوا تھا۔ بندر ناگ کے منہ پر تھوک تھوک کر اسے پتھر پر گرڑ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سانپ کی گرفت ڈھیلی ہو گئی اور وہ مر گیا۔ بندر کا جسم آزاد ہو گیا۔ اتنے میں رات کی تاریکی پھیل گئی۔ میں درخت کے موٹے تنے پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد چاند نکل آیا، میرے قریب کے درخت پر بیٹھے ہوئے بندر خرخر کرنے لگے۔ یکایک اس درخت سے ایک بندر لڑھکنیاں کھاتا ہوا زمین پر گرا، میں نے غور سے دیکھا تو وہی ناگ کا قاتل تو منہ بندر تھا۔ ایک کالے رنگ کی ناگن اس کی گردن سے لپٹی ہوئی تھی۔ وہ گھبرا کر تالاب کی طرف بھاگا اور گھاس پر گر کر مر گیا۔ وہ ناگن رنگیتی ہوئی سامنے ایک غار کی طرف روپوش ہو گئی۔

سنا کرتے تھے کہ ناگن اپنے ناگ کا انتقام لیے بغیر چین سے نہیں بیٹھتی لیکن اس روایت پر کبھی یقین نہیں کیا تھا۔ میں اس بندر کا انجام دیکھ کر حیران و ششدر رہ گیا۔ میں نے پھر تالاب کی طرف دیکھا تو ڈر کے مارے میرا دل بیٹھ گیا۔ تالاب کے اندر انسانی کھوپڑیاں تیر رہی تھیں۔ لمحہ بھر کے لیے میرا سانس رُک گیا، ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے بہت سے پڑا سر انسان سطح آب پر سر نکالے پانی کے اندر تیر رہے ہوں۔ میں مشہور انگریز

شکار یوں کے ہمراہ انتہائی بھیاں اور تاریک جنگلوں میں شکار کھیل چکا تھا لیکن ایسا ہیبت ناک منظر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ان کھوپڑیوں میں زرد چیتے کی سی آنکھیں چاند کی تیز چاندنی میں چمک رہی تھیں۔ مجھ پر موت کا سکوت طاری تھا اور میں اپنی غلطی پر سخت پشیمان تھا۔ رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ اس دشوار گزار پہاڑی پر چڑھنے سے میرا کے قاتل کا کیا تعلق؟ میں نے جائے واردات کو چھوڑ کر اس پہاڑ پر چڑھ کر سخت غلطی کی تھی۔

دوسرے لمحے ہمت کر کے میں نے پھر تالاب کی جانب دیکھا تو اپنی بزدلی پر سخت نادم ہوا کیونکہ ایک ادبلاؤ کووند دیکھتا تو فوراً واپس جا کر کرتل و لسن کو بتاتا کہ یہ پہاڑ بد رجوں کا مسکن ہے اور میراں کی موت میں ان ہی کا ہاتھ ہے۔ ادبلاؤ گوشت خور جانور ہے، یہ خشکی پر بھی چل پھر سکتا ہے لیکن اس کے جسم کی بناوٹ پانی کی زندگی کے لیے زیادہ موزوں ہے، یہ جتنے بنا کر پھیلیاں شکار کرتے ہیں اور دریاؤں اور تھیلوں کے کنارے بل بنا کر رہتے ہیں۔ رات درخت پر ہی گزار دی۔ صبح ہوئی تو پرندے چہچہانے لگے۔ میں درخت سے اُترتا ایک سوڑنے میرا استقبال کیا، میں نے فارغ کیا اس کی کھوپڑی اُڑ گئی، میں چوٹی کی طرف چل پڑا۔ تھوڑی دور چل کر ایک آبشار آیا میں وہاں پٹے کھا کر لیٹ گیا۔ دو پہر ڈھلے آٹھ کر آگے چل دیا۔ میرے سامنے خوب صورت پہاڑی نظاروں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ اچانک اس جنگل میں بین بننے کی سریلی آواز سنائی دی۔ میں نے ادھر ادھر بین بجانے والے کو تلاش کیا مگر پتہ نہ چلا، پھر وہ دل کش آواز بند ہو گئی۔ میں ایک پتھر پر بیٹھ گیا، سامنے سے بہت لمبا سفید رنگ کا ایک انتہائی حسین سانپ رنگینا ہوا آیا، میں نے راتقل شانے سے لگائی اور گھوڑا بادی۔ اس سانپ کے دو ٹکڑے ہو گئے، دفعۃً عقب سے آواز آئی۔ ”جناب یہ سانپ کیوں مار ڈالا“ میں نے پیچھے دیکھا ایک معمر شخص ہاتھ میں توڑے دار بندوق لیے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں غضب کی چمک تھی۔ میں نے پوچھا۔ یہ سانپ آپ کا تھا؟

”جناب میں اسے پکڑنا چاہتا تھا۔ یہ بہت نایاب ناگ تھا، میں اس کے منہ مانگے دام وصول کرتا، آپ شکار کی غرض سے یہاں آئے ہیں، آپ کو کیا بتاؤں کہ میں یہاں کیا کرنے آیا ہوں۔ مجھ سے ایک غلطی سرزد ہوئی ہے۔“

”پہیلیوں میں بات مت کیجئے۔ میں نے کہا۔ مجھے بتائیے کیا معاملہ ہے۔“

”کبھی میں بھی شکاری تھا۔“ اس نے کہا۔ ”پیشہ ور شکاری معاوضہ دینے میں بہت کنجوس ہوتے ہیں، اس لیے شکاری زندگی کو خیر باد کہہ میں نے سانپ پکڑنے شروع کر دیئے۔ ناگ، ڈیرہ دون اور مسوری میں یورپین سپیروں کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہوں۔ میرا نام نظام الدین ہے، میں ضلع آگرہ کا رہنے والا ہوں۔“

میں نے اسے بتایا کہ میں فوج میں رسالدار ہوں۔

اس نے کہا ”آپ میرے ساتھ چلیں، وہیں باتیں ہوں گی۔“

میں نظام الدین کے ہمراہ پہاڑی چوٹی کے عین نیچے ایک کھلے پہاڑ پر پہنچا۔ اس جگہ سے سینکڑوں میل دور تک پہاڑی مناظر صاف نظر آ رہے تھے۔ فطرت کی جلوہ آریاں انتہائی جاذب نظر تھیں۔ وہیں نظام الدین کا پناہ رکھا تھا۔ اس پناہ سے میں سیاہ رنگ کے چار زہریلے ناگ تھے۔ میں نے نظام الدین سے پوچھا کہ کیا بین کی آواز سانپ کو واقعی مدہوش کر دیتی ہے؟ وہ مسکرا کر کہنے لگا کہ سانپ کے کان نہیں ہوتے۔ بین تو محض دل بہلانے کا مشغلہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو سانپ پکڑنے کی کبھی ضرورت نہ ہوگی۔ اس لیے اس فن کو راز ہی رہنے دیجئے۔

وہ مجھے وہاں بٹھا کر چلا گیا اور مرغ شکار کر کے لے آیا۔ آگ کے الاؤ پر انہیں بھونا۔ ہم دونوں پیٹ بھر کر مرغ کھا چکے تو مغرب کی نماز ادا کی۔ کچھ سردی کی سی لہر آئی۔ میرے دانت جتنے لگے، کھیل اوڑھا اور الاؤ میں مزید لکڑیاں ڈال کر آگ جلائی تو طبیعت بحال ہوئی۔ میں پہاڑ کی چوٹی کی طرف دیکھنے لگا۔ بڑا دل کش منظر تھا۔ ڈوبتے سورج کی نارنجی کرنوں نے چوٹی پر جمی ہوئی سفید برف کو گھنار بنا رکھا تھا۔ اس رنگین برف کے اندر کہیں کہیں پہاڑی درختوں کے سبز پتے چمک رہے تھے۔

اچانک خوف ناک کڑک کے ساتھ شعلہ سالپکا اور برف کے اندر کھڑے ہوئے ایک درخت میں آگ بھڑک اٹھی۔ آگ کے خوف ناک شعلے آسمان کی طرف لپکنے لگے۔ میں نے دہشت زدہ ہو کر دیکھا۔ پہاڑی کی چوٹی کے چاروں طرف سیاہ رنگ کے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ بجلی پھر چمکی اور میں سمجھ گیا کہ درخت پر بجلی گری ہے۔ نظام الدین نے بتایا کہ ان پہاڑوں پر بجلی گرنے کا یہ معمول ہے۔

میں نے اسے میرا کیا پڑا سرا موت کا واقعہ سنایا تو نظام الدین چونک پڑا اور کہنے لگا۔ ”اچھا وہ بلا ابھی تک نیچے پہاڑ پر موجود ہے۔ جناب یہ معجزہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی ملاقات مجھ سے کرا دی“ وہ کچھ سوچ کر بولا کہ آپ میری بات پر یقین نہیں کریں گے۔ بڑا حیرت انگیز معاملہ ہے۔ ہاں البتہ اس مہم میں آپ کا ساتھ دینے کو تیار ہوں۔

دوسرے دن ہم دونوں اس خطرناک پہاڑی سے اتر کر کرٹل ولسن کے کمپ میں پہنچ گئے۔ کرٹل بہت فکر مند تھا میں نے نظام الدین سے تعارف کے بعد کرٹل کو اس کے ناگ دکھائے اور بتایا کہ میں نے انہیں اپنی مہم میں شامل کر لیا ہے۔ دوسرے دن نظام الدین، میں اور کرٹل ولسن جیسے پرہیزگار پھر وہ ہمیں ساتھ لیے ہوئے ایک گہرے کھڈ میں اتر گیا۔ اس کھڈ کے اندر ایک تاریک عمارت تھا۔ ہم بندوقیں سیدی کر کے ٹارچوں کی روشنی میں غار میں گھس گئے۔ آگے ایک موڑ آیا پھر غار کے اندر ہولناک منظر دیکھا۔ وہ ہمیشہ یاد رہے گا۔ غار کی دیوار خشک لبو سے لتھڑی ہوئی تھی اور اس خون سے رنگین دیوار کے نیچے تین انسانی ہڈیوں کے ڈھانچے پڑے تھے۔ ایک ڈھانچے کا بائیں ہاتھ غائب تھا۔ کرٹل آبدیدہ ہو کر بولا۔ یہ میرا یا ڈھانچہ ہے۔ میں نے دیکھا کہ سوکھی ہوئی کھوپڑی میں کہیں کہیں لمبے سنہرے بال موجود تھے۔ ان ڈھانچوں کے قریب ہی پھیل اور ہرٹوں کے سوکھے ہوئے سر اور ان کی ہڈیاں پڑی تھیں۔ نقصان سے ہمارے دماغ بچے جارہے تھے۔ کرٹل نے بائیں جانب ٹارچ کی روشنی بھینگی، ادھر میرا کے جوتے پڑے دیکھ کر وہ چھوٹ چھوٹ کر رونے لگا۔ نظام الدین بولا۔ ”کرٹل صاحب صبر کیجئے، میں بھی زخم زدہ ہوں، یہ ڈھانچہ میرے جگر کی دوست ظفر کا ہے۔ ظفر بھی میرا کی قاتل بلا کی بیعت چڑھا تھا۔ اب ہم انتقام لیں گے۔ اس نے پتھر پر ایک سفید نشان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”یہ خشک پیپ کا نشان ہے۔ یہ ثبوت ہے کہ وہ ان پہاڑیوں میں موجود ہے۔“

نظام الدین ہمیں اس مقام پر لے گیا جس جگہ دو کھڑے پہاڑوں کے درمیان دریا نے جمن، اس زور و شور سے بہہ رہا تھا کہ کانوں کے پردے پیٹے جارہے تھے۔ دریا کے ساتھ ساتھ کچھ دور چل کر نظام الدین رگ گیا اور بولا یہ دیکھئے یہ وہی غار والا پیپ کا نشان ہے۔ آئیے وہ اس جنگل میں داخل ہو چکی ہے۔ ہم دائیں طرف دریا سے تھوڑے فاصلے پر پہاڑ کے نیچے کم درختوں اور سرکندوں جیسے پودوں کے جنگل میں پہنچ گئے۔ چاروں اور چار راتیں اس جنگل کو چھاننے کے باوجود نتیجہ صفر نکلا۔

پانچویں روز ہی پیپ کا پڑا سرا وہ بھرتھریلی زمین پر پھر نظر آیا جو تازہ تھا، اس میں خون ملا ہوا تھا۔ نظام الدین خوشی سے چلایا۔ ہماری مہم آخری

منزل پر ہے، دیکھنا شیر جنگل کا ہم رنگ ہوتا ہے۔ شیر درختوں کے سائے میں بیٹھا ہوا، سورج چمک رہا ہو، کرنیں درختوں کے پتوں سے چھن چھن کر زمین پر گرتی ہوں تو زمین پر دھوپ اور سائے اس طرح ملے ہوتے ہیں جس طرح شیر کے جسم پر سیاہ دھاریاں ہوتی ہیں۔ اس لیے شیر کا رنگ اس کے لیے فائدہ مند اور شکاریوں کے لیے ضرر رساں ہوتا ہے۔ میں آپ لوگوں کو ہوشیار کر رہا ہوں کہ یہ جنگل شیر کے لیے مفید اور انسان کے لیے خطرناک ہے۔

وہ ادھر ادھر دیکھتا رہا اور اچانک ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی میں کہنے لگا۔ ”وہ دیکھئے شیر ہے۔“ واقعی ایک درخت کے نیچے شیر لیٹا ہوا تھا۔ ہمیں دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور پھر نہایت آہستہ آہستہ ہماری جانب بڑھا۔ ہمارے قریب کوئی درخت نہیں تھا جس سے ہم چھان کا کام لیتے۔ جنگل کے شہنشاہ کے چلنے کا شاہانہ وقار دیکھ کر ہماری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، اس نے انگڑائی لے کر منہ کھولا۔ لمبے اور نوکیلے دانت دیکھ کر ہم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ جن لوگوں کا شیر سے پالا پڑا ہے، وہ خوب جانتے ہیں کہ بغیر چھان کے آسنے سانسے مقابلہ کر کے شیر کو مار دینا انسان کی بہادری کم اور معجزہ زیادہ ہوتا ہے۔ شیر گولی کھا کر بھی ہمت نہیں ہارتا بلکہ گولی چلانے والے پر پورے غیظ و غضب سے حملہ کرتا ہے۔ میرے متعلق مشہور تھا کہ میں بغیر چھان کے شیر کو ہلاک کر دیتا ہوں لیکن میں ہی جانتا تھا کہ وہ جرأت کا کام نہیں بلکہ جنگل کے بادشاہ کے ساتھ جھوک ہوتا تھا۔ دو بد مقابلے کے لیے شکاری کی پشت پر تار درخت کا ہونا ضروری ہوتا ہے، لیکن میں کرٹل، ولسن اور نظام الدین بہت بڑے پھنسے تھے۔ ہمارے قریب کوئی درخت اور کسی قسم کی کوئی اونٹ نہیں تھی۔

شیر متکبرانہ ادا سے ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔ نہ غراہٹ تھی، نہ دھاڑ۔ وہ ہم سے بیس گز سے زیادہ دور نہ تھا۔ نظام الدین کے پاس توڑے دار بندوق تھی۔ میں نے اور کرٹل ولسن نے شیر کے منہ کا نشانہ لے کر اپنی اپنی رائفل سے ایک ساتھ دو فائر کیے، دھماکے کے ساتھ ہی میں اور شیر گھٹم گھٹا تھے۔ یہ اتنی تیزی سے ہوا کہ مجھے قطعاً علم نہ ہو سکا کہ یہ کیسے ہوا، پھر اچانک ہی میں اس کی گرفت سے نکل کر نشیب میں لڑھکتا چلا گیا۔ مجھے اتنی مہلت مل گئی کہ میں نے کھڑے ہو کر شیر کی طرف دیکھا، وہ جنگل کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔ میں نے اپنے کپڑے دیکھے، خون میں تر تھے۔ کرٹل ولسن اور نظام الدین آگئے۔ مجھے لبو میں نہایا دیکھ کر وہ گھبرا گئے، انہوں نے میرے جسم کی بوٹی بوٹی کا معائنہ کیا، نظام الدین خوش ہو کر بولا۔ ”یہ بہت بڑا معجزہ ہے“ کرٹل ولسن بولا۔ ”نظام الدین، یہ آپ کا کارنامہ ہے کہ ان کی زندگی بچ گئی۔ آپ نے ان سے کشتی لڑتے ہوئے شیر کی گردن میں خنجر گھونپ کر بڑی جرأت کا کام کیا ہے۔ شیر اس قدر شدید زخمی ہے کہ اس کا زندہ بھاگ جانا حیرت ناک ہے۔ وہ دریا کی سمت گیا ہے، دو گولیاں اس کے جسم میں گھس گئی ہیں اور نظام الدین کا خنجر اس کی گردن میں پیوست ہے۔“

میرا دل ابھی تک زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ تاہم میں نے ہمت کر کے کہا کہ ہمیں فوری طور پر زخمی شیر کا تعاقب کرنا چاہیے۔ ہم اس کے خون کے نشان دیکھتے چل پڑے، میرے حواس مکمل طور پر درست نہیں ہوئے تھے۔ قسمت کی قسم ظریفی ملاحظہ ہو کہ میں اپنے ساتھیوں سے جدا ہو گیا کیونکہ جنگل گھٹا اور میں زخمی تھا۔ آگے پگھڑی پر مجھے خون کا بڑا نشان ملا اور میرے سامنے تازہ لہو پٹکا جا رہا تھا۔ خون کا یہ نشان مجھے جیسے کی جانب لے گیا۔ میں جیسے کے قریب پہنچا تو سورج ڈوب گیا اور تاریکی پھیلنے لگی۔ قریب کی جھاڑیوں میں کسی انسان کے کراہنے کی آواز آئی۔ میں نے ٹارچ روشن کر کے ادھر دیکھا، کرٹل ولسن کا ایک گھڑا ملازم کرم سنگھ خون میں لت پت پڑا کر رہا تھا۔ میں نے اسے اٹھایا، کراہنے کی آواز کے ساتھ یہ الفاظ اس کی زبان سے نکلے کہ ”ریجا کو ناگ نے ڈس لیا ہے، میں آپ لوگوں کی تلاش.....“ الفاظ اس کے منہ میں انک کر رہے گئے اور اس کا سر ڈھلک گیا۔ وہ میرے ہاتھوں میں دم توڑ گیا۔

اتنے میں کرل صاحب اور نظام الدین آگئے وہ کرم سنگھ کی لاش دیکھ کر حیران رہ گئے۔ شیر نے اس کے پیٹ اور سینے کو چڑچھاڑ دیا تھا۔ انتزیاں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ ہم لاش اٹھا کر کیپ میں پیچھے۔ ریجائی کی طرح تڑپ رہا تھا اور اس کے منہ سے خون جاری تھا۔ چھ گھڑ والی ملازم پریشانی کے عالم میں اس کے پاس بیٹھے تھے۔ کرم سنگھ کی لاش دیکھ کر وہ زار و قطار رونے لگے۔ بزاروح فرسا منظر تھا، ایک گھڑ والی بولا۔ ”ریجیا کو نظام الدین کے ناگ نے ڈس لیا ہے۔ یہ پتارہ کھول کر سانپ دیکھ رہا تھا، کرم سنگھ آپ لوگوں کی تلاش میں گیا اور شیر کی جھپٹ میں آگیا۔ نظام الدین کہنے لگا، زخمی شیر نے مرتے مرتے کرم سنگھ کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ شیر کو ہم تلاش کر لیں گے، وہ زندہ نہیں بچ سکتا۔“

نظام الدین نے ریجیا کے ہاتھ کے زخم کو منہ سے چوسا۔ پھر اس پر دوائی لگائی اور ایک سفوف پانی میں گھول کر اسے پلایا اور اس نے کہا۔ ”انشاء اللہ ریجیا بچ جائے گا۔ اب ہمیں رات کی پروانہ کرتے ہوئے زخمی شیر کو تلاش کرنا چاہیے۔“

جس جگہ میریا کی لاش کا بچھو دیکھا تھا۔ ہم اس غار کے منہ پر پہنچے۔ اندر سے زخمی شیر کے زور زور سے سانس لینے کی آواز آئی۔ تارچ کی روشنی میں دیکھا، شیر غار کے دہانے سے تھوڑی دور اندر پڑا سسک رہا تھا۔ نظام الدین نے خوشی سے اچھل کر کہا کہ میریا کی قاتل بھی شیرنی ہے۔ شیرنی مر رہی تھی۔ کرل ولسن نے اپنی رائفل کی گولی اس کی چھاتی پر داغ دی، اس کے بدن کا خون پہلے نکل چکا تھا۔ گولی کھاتے ہی مر گئی، میں نے آگے بڑھ کر اس کی گردن سے نظام الدین کا بچھو نکالا پھر نظام الدین نے ہمیں اس کا منہ چیر کر دکھایا۔ میری اور کرل ولسن کی دو گولیاں اس کے کھلے ہوئے منہ میں داخل ہو کر پچھلا حصہ توڑ کر نکل گئی تھیں۔ دماغ صحیح سالم تھا پھر اس نے شیرنی کی زبان دکھائی۔ ایک گھڑی کا پرزہ اور خشے کا ٹکڑا اس کی زبان میں بیوست تھا جو ناسور بن گیا تھا۔ اس ناسور سے لہو اور پیپ رسی رہتی تھی۔ نظام الدین نے ایک فتح مند جزل کی طرح خوش ہو کر کہا، یہ ہاڈ نہیں سکتی تھی۔“

گھڑ والیوں کو بلا کر ہم شیرنی کی لاش کیپ میں لے گئے۔ صبح کے وقت گھڑ والیوں نے کرم سنگھ کی لاش چٹا میں جلادی۔ ریجیا کی حالت سنبھل گئی تھی۔ نظام الدین نے اسے مزید دوا پلائی پھر وہ ہمیں ساتھ لے کر اسی غار کے قریب پہنچا۔ وہاں ایک درخت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا۔ ”دو سال پہلے اس بڑے کے نیچے ہمارا کیپ تھا ایک شام میں اور میرا شکاری دوست ظفر، ہرن کا گوشت کاٹ رہے تھے۔ اچانک اس غار سے ایک شیر کا بچہ نمودار ہوا، ظفر نے تھوڑا سا ہرن کا گوشت بچے کی طرف پھینک دیا۔ وہ گوشت چاٹنے لگا۔ اسی لمحے ایک بیمار شیرنی غار سے نکلی۔ ہم گوشت اٹھا کر درخت پر چڑھ گئے۔ وہ بچہ گوشت چھوڑ کر اپنی ماں کے تھنوں کو چوسنے لگا۔ شیرنی بیمار اور بھوک تھی، دودھ خشک تھا، ظفر نے گوشت کے کئی ٹکڑے شیرنی کی جانب پھینک دیئے۔ وہ گوشت کھا کر اپنے بچے کو ساتھ لے کر واپس غار میں چلی گئی۔“

”یہ معمول بن گیا۔ ہمارے شکار کا بڑا حصہ وہ شیرنی کھانے لگی۔ اس میں جان آگئی، بچہ جو بھوک سے نڈھال تھا، چوڑیاں بھرنے لگا۔ ایک دن خرگوش کا گوشت بنا کر اسے پتھر پر رکھ کر میں وضو کرنے لگا۔ وضو کرتے وقت میں نے گھڑی کھول کر گوشت پر رکھ دی، اسی لمحے شیرنی آگئی میں ڈر کر درخت پر چڑھ گیا۔ گوشت کھاتے وقت میری گھڑی شیرنی کے منہ میں چلی گئی۔ وہ یک لخت گھبرا کر اچھلی۔ پھر اس نے اپنا منہ زمین کی طرف کھول دیا۔ اس کی زبان سے خون کی دھار بہہ رہی تھی۔ اس نے غصے میں میری جانب دیکھا اور پھر وہ بھاگ کر غار میں گھس گئی۔ بات آئی گئی ہوگئی۔

تیسرے دن ظفر کو طیر یا بختار ہو گیا تھا۔ اس کے لیے مرغ شکار کرنے چلا گیا۔ شکار لے کر واپس آیا تو ظفر غائب تھا اور درخت کے نیچے خون کے اوپر اس کی گھڑی پڑی تھی، میں سمجھ گیا کہ شیرنی میری گھڑی کھا کر نفسیاتی مرض کا شکار ہو چکی ہے۔ ظفر بخار کی شدت کی وجہ سے درخت پر نہ چڑھ سکا۔ شیرنی کی تیز نگاہوں نے اس کی بازو پر گھڑ بندھی ہوئی دیکھی تو آپے سے باہر ہو گئی اور انتقامی جذبے کے تحت اسے چیر پھاڑ کر لاش کہیں لے گئی اور نہایت ہوشیاری سے اس کی گھڑی نکال کر بیس ڈال گئی۔ یہ سب کچھ میری غلطی کا نتیجہ ہے اگر میں ظفر کو درخت پر چڑھ دیتا تو یہ حادثہ نہ ہوتا۔ اپنے جگر کی دوست ظفر کا قاتل میں ہوں۔ مجھ پر جنون کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ میں اپنی جان کو داؤ پر لگائے تارچ لے کر غار میں گھس گیا۔ اس وقت غار کے اندر شیرنی نہیں تھی۔ وہیں ظفر کی لاش پڑی تھی۔ اس کا بایاں بازو اور چہرہ قیہ ہو چکا تھا۔ میں غار سے نکل کر باہر بیٹھ گیا۔

”شیرنی کئی روز نظر نہ آئی۔ ایک شام شیرنی بچے کو ساتھ لے ہوئے غار کی طرف آئی، میں نے درخت پر چڑھ کر اس پر گولی چلا دی لیکن گولی سے بچہ ڈھیر ہو گیا۔ بھری ہوئی شیرنی نے غصے میں میری جانب جست لگائی اور درخت کے تنے سے نکل کر اوڑھ کر بھاگ گئی۔ اس واقعے کے دس منٹ بعد ایک گورا آیا، اس نے دکھ بھرے لب و لہجے میں مجھے بتایا کہ ہم جیسے کے قریب خیمے میں تھے۔ میرا چھوٹا بھائی باہر لیٹا ہوا تھا۔ یکا یک اس کے حلق سے چیخ بلند ہوئی، میں خیمے کے اندر سے نکلا، میرا بھائی غائب تھا۔ البتہ اس کا بایاں ہاتھ جس پر گھڑی بندھی ہوئی تھی۔ خیمے کے پیچھے پڑا تھا۔ یہ سب کچھ بجلی کی سی سرعت سے ہوا، میں اس طرف آیا تو بندوق کا دھماکہ سنائی دیا۔ میں اس گورے کو ساتھ لے کر جدھر سے شیرنی آئی تھی، ادھر گیا تو ایک تالے میں اس کے بھائی کی لاش پڑی تھی۔ بایاں ہاتھ نہیں تھا، اس کا سر بڑی طرح بھنبھوڑا دکھاتا تھا، پھر میں نے اور اس گورے شکاری نے شیرنی کا ایک مہینہ تک پیچھا کیا۔ وہ کئی مرتبہ نظر آئی، وہ جس جگہ نہ مارتی تھی وہاں خون یا پیپ کا دھبہ نظر آتا تھا۔ پھر وہ یکا یک غائب ہوگئی۔“

اچانک نظام الدین خاموش ہو گیا، میں نے بے تابی سے پوچھا، آگے کیا ہوا؟ دزدیدہ نگاہوں سے کرل ولسن کی جانب دیکھ کر کہا۔ جناب میریا کی قاتل بھی شیرنی تھی جس کو مار کر آپ نے اپنا انتقام لے لیا ہے۔ یہ میری شکاری زندگی کا انوکھا واقعہ ہے کہ شیرنی صرف ان انسانوں کو مارتی تھی جن کی کلائی پر گھڑی بندھی ہوتی تھی۔ وہ انسان کا گوشت نہیں کھاتی تھی۔ گھڑی والے بازو کو جسم سے الگ کر کے سر اور چہرے کو کھل دیتی تھی۔

